تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد04 | شمارہ 01 | ماہ جنوری 2019ء

سرپرست
محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
سید عبدالشکور
ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ انڈیا

Printed by Syed Abdul Shukoor and Published by Syed Abdul Shukoor
on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana,
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging ,
11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul,500 0 04 Hyderabad, T.S.
Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	سید عبدالشکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر وطابع	:	سید عبدالشکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب وتزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
صورت گری	:	محمد جنید اللہ بیگ
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طٰہٰ انٹر پرائزیس، پرنٹنگ اینڈ پبلیشنگ، ریڈ ہلز، لکڑی کا پُل، حیدرآباد
ماہ	:	جنوری 2019ء
جِلد	:	چہارم
شمارہ	:	(01)
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین :			
روسی انقلاب اور علامہ اقبال مارکس کمیونزم کا خالق عالمی دانشور	:	ڈاکٹر مسعود جعفری	7
سرسید۔۔۔ایک نئی تعبیر	:	ڈاکٹر جعفر جری	12
دکن میں اُردو صحافت کا ارتقاء	:	محمد طاہر رومانی	20
اقبال کے نغمات میں آیت کی جھلک ہوں	:	شجاعت علی مجیج	24
تین ادبی تحریکیں اور اُن کی ادبی معنویت	:	ڈاکٹر یم۔نظام الدین	28
کیا ادبی ترجمہ ممکن ہے؟	:	محمد طارق	32
فن ترجمہ۔ضرورت اور اہمیت	:	سیما انجم	38
ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھانے میں آزاد کا کلیدی رول :		تبریز حسین تاج	47
نعت گوئی کے ارتقاء میں علماء جامعہ نظامیہ کا حصہ	:	محمد عبدالعظیم نعمان	50
پروفیسر اشرف رفیع کی شاعری کی مختلف جہات (نظموں کے حوالے سے)	:	ڈاکٹر بدر سلطانہ	55
اُردو ہے میرا نام میں غالبؔ کی سہیلی	:	سعدیہ مشتاق	63
افسانے:			
محنت کی روٹی	:	محمد انیس فاروقی	65
وراثت	:	انجینئر محمد فرقان سنبھلی	68
میرا قصور کیا تھا؟	:	رُشدہ شاہین	72
حصہ نظم:			
غزلیں	:	رحمٰن جامیؔ	78
غزلیں	:	ڈاکٹر نادرؔ المسدوسی	79
غزلیں	:	جمیل نظام آبادی	80
غزلیں	:	فاروقؔ عارفی	81
غزلیں	:	محبوب خان اصغر	82

oOo

ہم کلامی

اکیسویں صدی کا 19 واں سال آپ سب کو مبارک ہو۔ ماہ جنوری 2019ء کا شمارہ آپ کے زیر نظر ہے۔ اس شمارے میں ممتاز ادیبوں' اسکالرس وقلم کاروں کے مضامین وافسانوں کے ساتھ ساتھ معروف شعرائے کرام کے کلام شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ یہ نگارشات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کا باعث بنیں گی۔

قارئین! ہم ہر آنے والے سال کے لئے پہلے سے کچھ منصوبے بناتے ہیں کہ اس سال فلاں کام کرنے ہیں' نئے پلان طئے کئے جاتے ہیں' بچوں کی تعلیم وتربیت میں پہلے سے بہتری لانے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں' اگر ایسا ہو رہا ہے تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم اپنے منصوبے پہلے سے بنائیں اور سال کے شروع سے ان منصوبوں پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اس میں ہم یہ دیکھیں کہ پچھلے سال ہم نے کیا چھوڑا' کون سا کام ایسا رہ گیا جس کی وجہ سے اس کام میں ہماری ترقی رک گئی' بچوں کی تعلیم میں وہ کیا کمی رہ گئی جس کے سبب ان کا تعلیمی ریکارڈ خراب ہوا یا جو نشانہ رکھا گیا تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ آگے اس سلسلہ میں کیا کیا جائے' کیسے ان کے تعلیمی ریکارڈ کو مزید بہتر بنایا جائے' انہیں مقابلہ اور مسابقت کے لئے کیسے تیار کیا جائے۔ ان تمام کاموں کو سنجیدگی اور نئے عزائم کے ساتھ پورا کرنے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان اُردو کی بھی فکر کریں کہ ہم نے اس زبان کی بقا اور تحفظ کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں۔ کیا ہم نے اپنی نئی نسل کو اس زبان سے واقف کرایا ہے؟ اردو زبان جس کے لئے ہمارے اسلاف نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور قطب شاہی دور اور آصف جاہی دور میں شمال سے جنوب کا سفر کر کے اس زبان کو معراج ملی' جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اُردو رہا' لیکن اس کے بعد ہم نے اس زبان پر زیادہ توجہ نہیں دی اور آج یہ زبان نئی نسل سے دور ہو رہی ہے' اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس زبان کو اپنے بچوں کو سکھائیں' پڑھائیں' اس کی بقا اور تحفظ کی کوششوں کا ساتھ دیں۔ اس کے علاوہ اپنے محلے اور بستی کے ماحول کو صحیح رکھنے کا بھی سوچیں' آپسی اتحاد و بھائی چارگی' اخلاق و کردار کو سدھارنے کی کوششیں بھی کریں' بچوں کو راتوں کو جاگنے اور چبوتروں' ہوٹلوں اور چوراہوں پر رات گزارنے سے بچائیں۔ والدین اور سرپرستوں کا اولین فریضہ ہے کہ اس ماحول کو مزید پرورش پانے سے روکیں۔ انہیں باضابطہ اخلاق' کردار اور وقت کی قدر کرنے کا درس دیں۔ نئے سال کی آمد پر میرا یہی پیام ہے کہ اپنی زبان کی حفاظت کریں' وقت کی قدر کریں اور اپنے ماحول کو صحیح کریں۔ جب جا کر ہماری ترقی ہو سکتی ہے۔ ہم دوسروں کے مقابلے میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اپنا' اپنے طبقے کا اور ریاست وملک کا بھلا کر سکتے ہیں' نام روشن کر سکتے ہیں۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی اُردو زبان وادب کی ترقی' ترویج اور فروغ کے سلسلہ میں اپنی اسکیمات پر عمل پیرا ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ تمام اسکیمیں پوری شفافیت کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔

ایس اے شکور

پروفیسر ایس اے شکور

ایڈیٹر

8.1.43]1]A]5

ڈاکٹر مسعود جعفری
ستیہ کالونی، شیخ پیٹ، حیدرآباد۔104 500 (تلنگانہ)

روسی انقلاب اور علامہ اقبالؒ

مارکس کمیونزم کا خالق عالمی دانشور

کارل مارکس ان آفاقی شخصیات میں سے ایک ہے جس نے وقت کا رخ پھیرا۔ تاریخ کا دھارا بدلا۔ خیالات کی دنیا میں ہلچل بپا کر دی۔ اقطائے عالم کو امیر غریب کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ڈارون نے اگر مرد اور عورت پر روشنی ڈالی تو مارکس نے سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ کی بات کی۔ مارکس کی 1867 میں لکھی ہوئی کتاب داس کیپیٹل Das Capital دنیا کے دہقانوں، مزدوروں اور مظلوم انسانوں کے لئے انجیل بن گئی۔ مارکس نے نئے تصورات روشناس کئے۔ طبقاتی کشمکش، افراط زر کا نظریہ، استحصال کی تھیوری، پرولتاریہ کی حکومت، ریاست کی تحلیل۔ مارکس نے نہ صرف انیسویں صدی بلکہ بیسویں صدی کو اپنی فکر و فلسفہ سے متاثر کیا۔

مارکس پروشیا جدید جرمن کا رہنے والا تھا۔ اس نے مختلف جامعات میں اپنی پڑھائی کی جیسے بان برلن ورجینا میں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مارکس نے پیرس کا بھی دورہ کیا۔ وہ اپنے گہرے دوست اینگلس کے ساتھ لندن گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مارکس کی معاشی حالت بہت خستہ تھی۔ لندن میں وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی شریک حیات تپ دق میں مبتلا تھی۔ اس کے تھوک میں خون آتا تھا۔ گھر کے ایسے دلخراش ماحول میں مارکس داس کیپیٹل تصنیف کر رہا تھا۔ اس کے جسم پہ شرٹ تھا نہ جیب میں پیسے۔ جب وہ کتاب لکھ چکا تو اسے پوسٹ کرنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ قلاش تھا۔ اس کے دوست کی مدد سے کتاب اشاعت کے مرحلوں سے گزر سکی۔ مارکس کو کیا خبر تھی کہ داس کیپیٹل دنیا کے لئے دوسری بائبل ثابت ہوگی۔ محنت کشوں کے لئے نوید صبح ہوگی۔ ایک نئے دور کی شروعات ہوگی۔ اس سے سماجی اقتصادی نیز سیاسی انقلابات کی راہیں ہموار ہوئیں۔

کارل مارکس جرمن یہودی تھا۔ لیکن اس نے یہودیت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس نے ہندوستان میں 1857 میں ہونے والے غدر کو طبقاتی کشاکش سے تعبیر کیا۔ مارکس کا یقین تھا کہ طبقاتی جدوجہد میں آخر میں فتح مظلوموں کی ہوتی ہے۔ سرمایہ داروں کو شکست فاش ہوتی

ہے۔Haveاور Have nots میں مسلسل آویزش ہوتی رہتی ہے۔اس میں ورکنگ کلاسس کو کامیابی ملتی ہے۔ مارکس کی وفات 1883 میں ہوئی۔اس کی لندن میں تدفین ہوئی۔ اس کے انتقال کے 34 برس بعد اکتوبر 1917 میں مملکت روس میں کمیونزم کا خوں ریز انقلاب آیا۔شہنشاہ زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔انقلاب کا رہنما لینن تھا۔زار کے سیاہ ظالمانہ دور کا خاتمہ ہو گیا۔ سماجی و معاشی مساوات قائم کی گئی۔ روس دنیا کا پہلا ایسا ملک بن گیا جہاں پہلی دفعہ کسانوں مزدوروں کی مملکت تشکیل دی گئی۔

اب روس سویٹ یونین بن گیا تھا۔شاعر مشرق علامہ اقبال روس کے انقلاب سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے مارکس کے تعلق سے کہا کہ وہ پیغمبر نہیں ہے لیکن اس کی بغل میں ایک کتاب ہے۔اقبال کا اشارہ داس کیپیٹل Das Capital کی طرف تھا۔جس نے کائناتی سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کی۔امیر غریب کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دی۔سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کو عیاں کیا۔دنیا کے غریبوں کے منہ میں زبان اوران کے نحیف ونزار ہاتھوں کو طاقت عطا کی۔

اقبال نے 1917 کے روسی سنگھرش اور کرانتی کا پرتپاک خیر مقدم فرمایا۔اقبال نے پکار کے کہا:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ooo

اقبال نے ایک نظم بولشہک روس کے نام سے لکھی اوراس میں نہایت چونکا دینے والے افکار شعری پیرہن میں پیش فرمائے۔آپ بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں:

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب وغریب
خبر نہیں کہ ضمیر جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسر چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظ چلیپا کو مانتے تھے نجات
یہ وحی دہریت روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات ومنات

ooo

اقبال ایک طاقتور لفظ وحی استعمال کر رہے ہیں جو منجانب خدا نازل ہوتی ہے۔اقبال لات ومنات جیسے بتوں کی تلمیح بھی دے رہے ہیں۔کہہ رہے ہیں کہ انہیں پاش پاش کردو۔جس طرح اسلامی تاریخ میں مکہ کے انقلاب یعنی فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ نے حرم سے تین سو ساٹھ بتوں بشمول لات ومنات کو ہٹا ڈالا۔کعبہ کو اصنام کے وجود سے پاک کر ڈالا۔اسی طرح روس کے چرچوں سے بتوں کا صفایا کردے۔یہی روس کی روح انقلاب ہے۔اقبال اپنی ایک نظم اشتراکیت میں واضح طور پر فرماتے ہیں کہ جو بات خدائے تعالی نے حرف قل العفو میں ارشاد فرمائی ہے اس کی عملی صورت گری روس میں آشکار ہونے لگی ہے یعنی سماجی مساوات وعدل وانصاف' سیاسی، اقتصادی، سماجی و مذہبی استحصال سے آدمی کو نجات۔اقبال کے روح پرور اشعار کا دیدار کیجیے:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئی گفتار
اندیشہ ہوا شو خی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن ائے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کر دار
جو حرف قل ا لعفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبال نے ایک ایسے منصفانہ معاشرہ کی امید کی تھی جہاں انسانی قدروں سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ انسان کی انسان پر مطلق الانانیت کا بول بالا نہ ہوگا۔اسی بند میں اقبال مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے میں جدت کردار پیدا کرے۔لکیر کا فقیر نہ بنے۔فکری سطح پر جامد نہ ہوجائے۔فکروتدبر سے کام لے۔جدت طرازی یعنی Innovative رہے۔حرکیاتی کردار رہے۔بے عملی کی برف پگھلے۔نئی دریافتیں کرے۔ستاروں پہ کمندیں ڈالے۔ کائنات کو تسخیر کرے۔

اقبال یہیں تک نہیں رکتے وہ روسی انقلاب کے قائد لینن کو خدا کے حضور پہونچا دیتے ہیں اور وہ خدا سے مکالمہ کرنے لگتا ہے۔آپ اس کی عرض تمنا دیکھئے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تنگ بہت بندہ مزدور کے حالات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

لینن دنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ چاہتا ہے۔منشا مزدوروں، دہقانوں کی فلاح و بہبود ہے۔اقبال کے اشعار آتش و شرارے اگلنے لگتے ہیں۔ان میں ایک عتاب اور جلال پیدا ہوجاتا ہے۔اقبال اپنے خیالات خدا کی زبان سے کہلواتے ہیں اس انقلابی نظم کا عنوان ہے ''فرمان خدا فرشتوں سے'':

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلادو
گرماو غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک و فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
میں ناخوش بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اس پوری نظم کا رنگ و آہنگ انقلابی ہے۔اقبال یہاں تک کہتے ہوئے نہیں چوکتے:

بہتر ہے چراغ حرم و دَیر بجھا دو

ایک آتش فشاں لاوا ہے جو ابل رہا ہے۔چاہتا ہے کہ امیروں کے قصر وایواں کو جلا کر بھسم کردے۔فرسودہ وکہنہ نظام کو جلا کر خاکستر کردے۔ایک نئے عادلانہ نظام نو

کی تخلیق کی جائے جہاں ہر فرد بشر کو روٹی کپڑا مکان دستیاب ہو۔ ہر چہرے پر تبسم ہو۔ ہر آنکھ میں خوشی کے چراغ ہوں۔ سوسائٹی ہر نوع کے ظلم وستم اور استحصال سے محفوظ رہے۔ ہندوستان اس کسوٹی پر اترا اور نہ ہی پاکستان و افغانستان۔ یہ تصور ایک Ideal State بن کر رہ گیا۔

اقبال کے ہاں عینیت پسندی Idealism ملتی ہے۔ خودی، شاہین، مرد کامل کے تصورات اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اقبال نطشے کے مرد کامل یا Super Man سے متاثر رہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا:

کافر ہو تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

میدان کارزار میں ہتھیاروں کے بغیر معرکہ آرائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کربلا ہو یا مہا بھارت سارے معرکے تیغ وتبر، تیر وتفنگ کے بنا سر نہیں کئے جاسکے۔ بے تیغ کی لڑائی ایک خوش خیالی سے زیادہ نہیں۔ وہ زمینی حقائق سے میل نہیں کھاتی۔ اقبال اور فلسفیوں جیسے برگساں، ہیگل کی طرح عینیت پسند ہیں۔ کارل مارکس بھی ایک عینیت پسند یا Idealist مفکر تھا۔ اس کا ریاست کے تحلیل ہو جانے کا تصور خالص مثالیت Pure Idealism کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ریاست تاریخ یا وقت کے کسی موڑ پر بھی تحلیل نہیں ہوتی۔ اس میں ہیشگی ہوتی ہے۔ اس کی شکل کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ ہو یا آمرانہ۔

اقبال اور کارل مارکس میں فرق یہ ہے کہ اقبال مذہب کو اپنی فکر رسا کا محور بنا دیتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ضرب کلیم اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ان کے یہ سارے اشعار مذہبی فلسفہ کی آئینہ داری کرتے ہیں:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

ooo

کارل مارکس تاریخ کے جدلیاتی تصور کو مانتا ہے۔ وہ کلاس وار طبقاتی کشاکش کو پیش کرتا ہے۔ مارکس نے مذہب کو ایک افیوم سے تشبیہ دی۔ وہ مادیت کا ترجمان تھا۔ اقبال روحانیت کے قائل تھے۔ مارکس اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھا:

گرماو غلاموں کا لہو جوش یقیں سے
کنجشک و فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

اقبال 1930 میں ایک مسلم وفاق Muslim Federation کا تصور الہ باد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں پیش فرماتے ہیں۔ کارل مارکس 1848 میں اپنی اشتراکیت کے منشور جسے عرف عام میں Communist Manifesto کہا جاتا ہے۔ اس میں ساری دنیا کے محنت کش عوام کو للکار کے آواز دی جاتی ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام

کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں گی۔وہ آزاد ہو جا یں گے۔

اقبال اور کارل مارکس میں قدر مشترک حریت کا تصور ہے۔دونوں میں محکومی و غلامی سے نفرت پائی جاتی ہے۔ دونوں بھی استعماری نظام کے نکتہ چیں ہیں۔دونوں میں بنی نوع انسان کے لئے محکومی کو سمِ قاتل سمجھنے کا خیال بدرجہ اتم موجود ہے۔دونوں بھی آزادی وحریت کے پاسباں وحدی خواں ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں:

ہو اگر قوت فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

ooo

اقبال نے کلیمی کو بھی ایک لعنت ایک عذاب سے موسوم کیا' اگر وہ فرعون جیسے ظالم وجابر مطلق العنان بادشاہ کے زیر تسلط پرورش پا رہی ہو تو اقبال ڈکٹیٹر شپ کے سخت خلاف تھے۔وہ افلاطونی جمہوریت کے قائل تھے۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اقبال کی فکر پر اشتراکیت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اس کا اقبال نے اپنی شاعری میں جا بجا ذکر فرمایا ہے۔اقبال کے فکری نظام میں جہاں ہیگل، برگساں نطشے، رومی، بھرتری ہری کے خیالات رواں دواں دکھائی دیتے ہیں وہیں کارل مارکس بھی ان کی فکر پر اثر انداز ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لئے اقبال کو مفکر شاعر Thinker Poet کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

اقوال زرین

☆ کسی کو دکھ دینے والا کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ کسی کی بے بسی پہ مت ہنسو' کل یہ وقت تم پر بھی آ سکتا ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

☆ کسی کی آنکھ تمہاری وجہ سے نم نہ ہو' کیونکہ تمہیں اُس کے ہر آنسو کا قرض چکانا ہوگا۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

☆ مظلوم اور نمازی کی آہ سے ڈرو' کیونکہ آہ کسی کی بھی ہو عرش کو چیر کر اللہ کے پاس جاتی ہے۔(حضرت علیؓ)

☆ نفس وہ بھوکا کُتّا ہے جو انسان سے غلط کام کروانے کے لئے اس وقت تک بھونکتا رہتا ہے جب تک وہ غلط کام کروا نہ لے' اور جب انسان وہ کام کر لیتا ہے تو یہ کُتّا سو جاتا ہے لیکن سونے سے پہلے ضمیر کو جگا جاتا ہے۔
(امام غزالیؒ)

☆ حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں:
۔ جس کی امیری اُس کے لباس میں ہو وہ ہمیشہ فقیر رہے گا اور جس کی امیری اُس کے دل میں ہو وہ ہمیشہ غنی رہے گا۔

☆ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:
۔ تُو اللہ کی راہ میں مستحق کو بھی دے' اور اُسے بھی دے جو مستحق نہیں۔اللہ تجھے وہ دے گا جس کا تُو مستحق ہے' اور وہ بھی دے گا جس کا تو مستحق نہیں۔

oOo

ڈاکٹر جعفر جری
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
ساتاواہنا یونیورسٹی (کریم نگر)

سرسید۔۔۔ایک نئی تعبیر

سرسید احمد خاں کا دور ہندستان میں انگریزوں کے اقتدار، قدم جمانے اور ہندستانیوں کو ہمیشہ کے لیے سرنگوں کرنے کا دور تھا۔ اس کے باوجود سرسید احمد خاں نے ہندستانیوں کو اَنگریزی تعلیم سے آراستہ کرنے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور قومی شعور بیدار کرنے کی تحریک چلائی۔ جس کی وجہ سے سرسید کو اپنی تحریک کے ذریعے مختلف محاذوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ اُنھوں نے زبان اور علوم کی تعلیم سے زیادہ فن اور ٹکنیک کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ایسی تدریس کا خاکہ مرتب کیا جس سے ہندستانی عوام میں ہنرمندی اور انگریزی زبان میں پھیلنے والی سائنسی، تکنیکی اور کاروباری ترقیات کے چشموں کو ہندستان میں سیراب کرنے کا موقع فراہم ہوا۔

سرسید کے کارنامے ہمہ جہت ہیں، اُس دور میں سارے ہندستان کی مشترکہ زبان اُردو ہونے کی وجہ سے تمام کارنامے اُردو زبان میں انجام دیے جاتے تھے۔ بہت ہی مختصر عرصے میں سرسید کے خوابوں کی تابناک تعبیریں بھی تیز رفتاری سے وجود میں آ گئیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اِس ترقی یافتہ ہندستان کے جمہوری دور میں بھی سرسید احمد خاں کے کاموں کی انجام دہی صرف اُردو اور انگریزی زبانوں میں ہی نہیں، بلکہ ملک کی دیگر علاقائی زبانوں کے ذریعے عوام کو پہنچانا ضروری ہے۔ سرسید کے ایسے ہی اصلاحی کاموں کی موجودہ معاشرہ میں کمی کی وجہ سے ملک میں آئے دن فرقہ وارانہ اور ہجومی تشدد کے غلبے، ایک دوسرے کے مذاہب پر اعتراضات کے علاوہ دیگر پسماندہ طبقات کو آج بھی جو حق ملنا ہے اس شعور کا رجحان بھی بہت کم ہے۔

''سرسید۔۔۔ایک نئی تعبیر'' جیسے موضوع کا احاطہ مختلف زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مضمون میں شامل چند ذیلی نکات کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ جسے ''سرسید کے خوابوں کی تعبیر۔ سائنسی ذہن''، ''غلط فہمیوں کا اِزالہ''، ''تعلیمی شعور کی بیداری''، ''رفقاء کے ماحول کی تیاری''، ''علوم اور ٹکنالوجی میں توازن''، ''اَدب اور مذہب کی پاسداری'' اور ''عالمی تناظر کی نمائندگی'' کے عنوانات سے واضح کیا جائے گا۔

(۱) سرسید کے خوابوں کی تعبیر۔ سائنسی ذہن :

ہندستان میں موجود ہر مذہب اور ہر طبقے کے افراد

کو سائنسی ذہن سے وابستہ کرنے کے لیے اپنے عہد میں سرسید احمد خاں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا قیام عمل لایا۔اس دور میں سارے ہندستان کی زبان اُردو تھی ۔ ہندستان میں بسنے والے تمام لوگ اُردو جانتے تھے۔حتیٰ کہ اُس دور میں اقتدار پر فائض انگریز حکمراں بھی اُردو سے رغبت رکھتے تھے۔ متحدہ ہندستان میں بسنے والے باشندوں کے ذہن کو سائنسی مزاج سے روشناس کرنے کے لیے سرسید نے انگریزی میں شائع ہونے والی سائنسی کتابوں کے اُردو میں ترجمے کروانے کی بنیاد رکھی۔اُس زمانے میں بدشگونی کا رجحان عام تھا،جس کا خاتمہ کرنے کے لیے ہوا، پانی، بادل، بخارات ہی نہیں بلکہ بگولے جیسے موضوعات پر سائنسی نظریات پیش کرتے ہوئے کتابوں کی اشاعت کے ذریعے ہندستانیوں میں پھیلنے والی غلط رسومات کے خاتمے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔

آزادی کے طویل عرصے بعد آج بھی ہندستانی عوام کے مزاج پر پرانی قدیم تہذیب اوراس کے غیر سائنسی نظریات کا دور دورہ ہے اوراس کو گلے لگا کر ملک کا معاشرہ ترقی کرنا چاہتا ہے۔جس طرح سرسید احمد خاں نے ملک کے باشندوں کا ذہن سائنسی بنانے کے لیے ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی اور اُردو زبان میں غیر سائنٹفک خیالات کو رد کرنے کا آغاز کیا ۔آج ہندستان میں موجود بے شمار ریاستوں میں بولی،لکھی ، پڑھی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے ۔سائنسی خیالات کو فروغ دیا جائے اور غیر سائنسی خیالات کو رد کیا جائے ،تاکہ نئی نسل کو سدھارنے اوراس کے توسط سے سائنسی ذہن بنانے کا موقع ملے ۔اس طرح ہر ذات ،فرقہ اور مذہب کے افراد میں شعور بیدار ہوگا اوراس شعور کی وجہ سے مختلف قسم کی برائیوں اور کمزوریوں کا خاتمہ ہوگا ، جیسے توہم پرستی ، ذات پات کی تفریق، مذہب اور رنگ ونسل کے نام پر جھگڑے بلاشبہ سب ختم ہوجائیں گے ۔انسان اور انسانیت کی قدروں کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔

(۲) غلط فہمیوں کا اِزالہ :

سرسید احمد خاں کا مطالعہ بہت وسیع تھا ، تاریخِ اِسلام کو بھی بہت پڑھا تھا ۔جس طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبویؐ میں دشمنانِ اِسلام کو سرورِ کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں خاص طور پر آپؐ پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب اپنی شاعری کے ذریعہ دیا اور آپؐ کی شان اور مرتبہ کو بیان فرماتے ہوئے نعت کے دفتر کھولے۔

چناں چہ سرسید احمد خاں کے دور میں ایک انگریز مصنف ولیم میور نے انگریزی زبان میں ''دی لائف آف محمدؐ'' لکھ کر پیغمبر اِسلام رسولِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگائی تھی ، اِس غلط فہمی کا خاتمہ کرنے کے لیے خود سرسید نے انگلستان کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانے ''برٹش میوزیم لائبریری'' کی تحقیقی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے ولیم میور کی کتاب کا جواب اُردو زبان میں بہ عنوان ''خطبات احمدیہ'' پیش کیا۔جس میں بے شمار غلط فہمیوں کے مدلل جوابات درج کیے گئے ۔

سرسید نے اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا

اور انگریز عہدیداروں کو یہ انمول تحفہ پیش کیا، تاکہ انگریزی میں مطالعہ کرنے والے انگریزوں کے دلوں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں، وہ دور ہو جائیں۔ یہ کام سرسید کی دوراندیشی کی تعبیر تھی کہ آنے والے زمانے میں بھی اِس طرح کے فتنے برپا ہوں گے اور اِن فتنوں کا جواب یا کسی بھی قسم کی غلط فہمی کا اِزالہ پُرامن طریقے سے کیا جاسکے۔

(۳) تعلیمی شعور کی بیداری :

''سرسید احمد خاں کی دیرینہ حسرت و آرزو تھی کہ ہندستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے لوگوں میں تعلیمی شعور کی بیداری کا صور پھونکا جائے۔ راس مسعود لکھتے ہیں:

''۔۔۔مغرب کے طریقۂ تعلیم نے سرسید کو بہت متاثر کیا۔ لندن میں قیام کے دوران ہی ایک ایسے دارالعلوم کا خواب دیکھنے لگے جہاں کیمبرج کے طرز پر تعلیم کا اہتمام ہو سکے۔'' {خطوطِ سرسید۔ مرتبہ سید راس مسعود۔ ص:۵۸}۔

ان ہی دنوں جس چیز نے سرسید کو متاثر کیا وہ انگریزوں کی تہذیب اور شائستگی تھی، اسی وجہ سے سرسید کے نزدیک انگریزی تعلیم کو عالمی سطح پر زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ انگریز قوم کے ذریعے ساری دنیا میں سائنسی ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ جاری تھا۔ اس لیے انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے یہ لازمی سمجھا کہ کسی بھی قوم اور مذہب کے ماننے والوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے انگریزی تعلیم ضروری ہے۔ بہ قول مولانا الطاف حسین حالؔی:

''اس مقصد کی تکمیل اور اس خواب کی تعبیر کے لیے انھوں نے سب سے پہلے ''مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ'' قائم کیا، جو ترقی کرتے ہوئے ایم اے او کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اُس دور میں سرسید کے دو اہم کارنامے غازی پور مدرسہ اور سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ہیں۔ {مولانا الطاف حسین حالؔی۔ ''حیاتِ جاوید'' ص:۱۶۸، مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۵۷ء}

مدرسے کا مقصد نونہالانِ وطن کو نئی تعلیم سے روشناس کرانا تھا اور سوسائٹی کا مقصد بڑوں کو علومِ نو سے متعارف کروانا۔ کیوں کہ اُس زمانے میں انگریزی تعلیم مذہب کے خلاف تصور کی جارہی تھی۔

سرسید نے نہ صرف اپنے عہد کے تقاضوں کی تکمیل کی، بلکہ آنے والے زمانے کی تعبیر کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تدریس کا انتظام کر کے ہندستانیوں کے ذہن میں اس شعور کی بیداری کی طرف توجہ دی، کہ وہ وسیع النظرفی کا ثبوت دیں، بلکہ ہر ہندستانی طالبِ علم کو خواہ کسی بھی مذہب، ذات، فرقہ یا قبیلے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، اس کے ذہن کو عالمی زبانوں سے ہم آہنگ کروانے، اس کے بولنے اور سمجھنے والوں سے اُنسیت پیدا کرنے کا ماحول تیار کیا۔ مختلف علاقوں کے طالبِ علموں کو اپنے کالج میں داخلے دیے اور یکجہتی کا خوشگوار ماحول پیدا کیا، جو آج کے دور کی بے حد اہم ضرورت ثابت ہوتے ہیں۔

موجودہ حالات میں اگر ہندستانی علاقائی، لسانی اور مذہبی جھگڑوں سے نکل کر سرسید کے بتائے ہوئے طریقے

پر علاقائی زبانوں کے اَدبیات میں اُن کے بزرگوں کے نیک کارناموں کو پیش کرنے کا شعور پیدا کریں۔ مختلف زبانوں کے دانشور، شاعر، اَدیب اور ماہرینِ تعلیم نہ صرف اپنی مادری زبان بلکہ دیگر علاقائی زبانوں میں بھی مواد فراہم کرتے ہوئے نفرت و بدامنی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ جس سے اُخوت و بھائی چارہ کا خوشگوار ماحول تیار ہوگا۔ سرسید کی یہ تعبیر یعنی تعلیمی شعور کی بیداری پیدا کرنا موجودہ جمہوری ہندستان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

(۴) رفقاء کے ماحول کی تیاری :

سرسید احمد خاں نے اپنے عہد میں اَدب، مذہب، سائنس اور دیگر علوم میں مضامین اور تصانیف پیش کرنے والوں کا اہم گروہ تیار کیا تھا' جو سرسید کے نامور رفقاء کہلاتے تھے۔ جن میں مولانا حالؔی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، محمد حسین آزاد، مولوی ذکا اللہ اور نواب وقار الملک وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے شعروادب، تاریخ، سائنس، مذہب اور دیگر علوم وفنون میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ سرسید نئی تعلیم کے حامی اور جدید ترقی کے علم بردار تھے۔ بہ قول بھٹناگر:

''انھوں نے رسول اکرمؐ کے اُسوہء حسنہ پر عمل کرنے کے لیے اَخلاقیات کی خالص قدروں کو فروغ دینے کی سعی کی۔'' { ایس کے بھٹناگر۔ ہسٹری آف ایم او اے کالج، علی گڑھ۔ ص: ۳۲۔ مطبوعہ، علیگڑھ۔}

سرسید نے جس طرح قومی زندگی میں نیا ولولہ پیدا کیا تھا اُسے بیدار رکھنے کے لیے، ملّی تاریخ سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اسی نقطہء نظر سے سرسید نے ''آئینِ اکبری''، ''تزکِ جہانگیری'' اور ''تاریخ فیروز شاہی'' کو دوبارہ مرتب کیا۔

مولانا شبلی نے ''سیرۃ النبیؐ''، ''الفاروق۔ المامون'' اور ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' جیسی کتابیں لکھیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے ''تاریخ ہندستان'' تالیف کی۔ محسن الملک اپنی ذات میں انجمن تھے۔ اِبتداء میں سرسید کے مذہبی نظریات اور قومی ارادوں سے اتفاق نہ تھا، جب ''تبیئن الکلام'' شائع ہوئی، تو محسن ملک نے اس سے اختلاف کیا۔ لیکن جب سرسید کے حلقہ بگوش ہوئے تو اپنی ذات کو سرسید کی فکر وآگہی میں ضم کر دیا اور ''تہذیب الاخلاق'' کے اہم مضمون نگار کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہوئے۔

مولوی چراغ علی اُردو کے نامور مصنفین میں شمار نہیں ہوتے، تاہم انھوں نے سرسید کے افکار وخیالات کو اس خوبی سے پھیلایا کہ یہ عام لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

''چناں چہ اُنیسویں صدی میں جب افکار و نظریات کی نئی رو چلی اور مذہبی مناظروں کو فروغ حاصل ہوا تو مولوی چراغ علی نے معترضینِ اِسلام کی تردید میں دفاعی مورچہ قائم کیا اور متعدد رسائل لکھ کر اِسلام کی حقانیت کو ثابت کیا۔'' {ڈاکٹر انور سدید۔ اُردو اَدب کی تحریکیں۔ ص: ۳۲۵، کتابی دنیا، دہلی۔ ۲۰۰۴ء}۔

نواب وقار الملک نے سرسید کے منصوبے سائنٹیفک سوسائٹی کے مقاصد کو پروان چڑھانے میں مکمل عملی تعاون پہنچایا۔ ممتاز معین ''دی علی گڑھ مومنٹ'' میں لکھتے ہیں:

''سرسید ان خدمات سے بہت متاثر ہوئے اور مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ایک عمارت ''مشتاق منزل'' اُن کے نام سے موسوم کی۔''{ممتاز معین۔دی علی گڑھ مومنٹ۔ص: ۱۵۳،کراچی۔۱۹۷۶ء}

سرسید نے جس فکری زاویے سے اپنی تحریک کو اُبھارا تھا۔شبلی نے اُسے مستحکم کرنے کی کوشش کی۔شبلی اَدیب اور شاعر ہی نہ تھے، عالم ومفکر بھی تھے۔اُنھوں نے سرسید کی تحریک سے ہی روشنی حاصل نہیں کی بلکہ وہ خود بھی روشنی کا مینار تھے۔چناں چہ یہ شخصی انفرادیت سرسید کی نئی تعبیر کے لیے اضافی قوت کا سرچشمہ بھی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ سرسید کے جامع الصفات رفقاء میں شامل ہوئے۔''علم الکلام''، ''الکلام''، ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم'' جیسی کتابیں تصنیف کیں۔سرسید ہمیشہ آگے بڑھنے کے لیے ماضی سے روشنی حاصل کرتے تھے اور شبلی گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑانے اور دورِ عظمت کی تجدید کے خواہاں تھے۔مگر دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔

مولوی ذکاء اللہ دہلوی کا شمار سرسید کے اُن رفقاء میں ہوتا ہے جنھوں نے سرسید کی تحریک کا پیغام بچوں تک پہنچانے کے لیے درسی کتب تصنیف کیں۔وحیدالدین سلیم جو مولانا حالؔی کے توسط سے سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ ہوکر آئے اور کچھ دنوں بعد ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کی ادارت میں سرسید کا ہاتھ بٹایا۔سرسید کے فیضِ صحبت نے انھیں تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی طرف متوجہ کیا۔وحیدالدین سلیم نے رسالہ ''معارف'' کے ذریعے اَدب کے نئے کارواں کا ماحول تیار کیا۔

عبدالحلیم شرر کا شمار بھی رفقائے سرسید میں ہوتا ہے۔شرؔر نے رسالہ ''مہذب'' اور ''دل گداز'' کے ذریعہ سرسید کی تحریک کو آگے بڑھانے کی سعی کی۔مولوی نذیر احمد نے سرسید کی تعبیر کو صرف علی گڑھ تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ اس کی وسعت کا کام انجام دیا۔

الغرض سرسید بہت ہی خوش قسمت تھے کہ انھیں جو رفقاء ملے درحقیقت صالح مشیر تھے اور اُن سب میں نہ صرف تصنیفی صلاحیتیں تھیں، بلکہ دور اندیشی، قوم کی فکر اور مسائل کے حل کا جذبہ بدرجۂ اَتم موجود تھا۔

(۵) علوم اور ٹکنالوجی میں توازن :

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں ایم او اے کالج اور بعد اذاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھ کر علوم وفنون کی تدریس وتعلیم میں توازن پیدا کیا۔جس کی مثال سارے ہندوستان میں ملنی مشکل ہے۔علوم عمرانیات، علوم لسانیات، علوم السنہ اور سماجی علوم کی اہمیت میں اضافہ کیا۔اگرچہ سرسید نے انگریز قوم کے علوم وفنون کو اہمیت دی لیکن انھوں نے تمام علوم وفنون کی تعلیم وتدریس میں توازن برقرار رکھا۔سائنسی علوم کو بڑھاوا دے کر دوسرے علوم کو کمتر قرار دینے سے گریز برتا۔

دورِ حاضر میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور جدید افادی علوم کی اہمیت کے نتیجے میں علمی توازن بگڑتا جارہا ہے۔سائنس وٹکنالوجی کے علاوہ دوسرے جلد فائدہ پہنچنے والے علوم سے رغبت کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ پیشہ ورانہ کورسس کی تعلیم سے

قریب ہوتے جارہے ہیں اور قدیم، روایتی، مذہبی تعلیم سے دوری اختیار کی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا رجحان متزلزل ہورہا ہے۔ غرض سماج کے مختلف طبقے اس طریقۂ تعلیم سے معاشرے کو عدم توازن بنارہے ہیں۔ ہر طالبِ علم ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی تمنّا رکھے اور اسی کے پیچھے دوڑتا رہے تو پھر ملک کے بڑے طبقات میں معاشی خوشحالی اور عام طبقات میں بدحالی پھیلتی جائے گی۔

سرسید نے اپنے دور میں تعلیم کو phase wise اَساس پر شروع کیا۔ چناں چہ انھوں نے پہلے جاگیرداروں کے لیے، پھر اَعلیٰ طبقہ اور اس کے بعد کمتر طبقہ اور سب سے آخر میں خواتین کی تعلیم پر زور دیا تھا۔ کیوں کہ اُس دور میں تعلیم پر ہوئے مصارف پر کسی ادارے کی طرف سے مدد فراہم نہیں ہوا کرتی تھی۔ جس طرح آج کے دور میں حکومت کے مختلف ادارے موجود ہیں۔ سرسید نے ایک ایسے زمانے میں تعلیم کو رواج دے کر عوام کے ذہنوں کو تبدیل کیا جسے موجودہ دور میں اختیار کرنا اُن کے خوابوں کی تعبیر کے مماثل ہے۔

(۶) اَدب اور مذہب کی پاسداری :

سرسید احمد خاں نے اپنے دور میں اخلاق، تہذیب، اَدب اور مذہب کی پاسداری پر توجہ دی اور اپنے رفقاء کو صالح اَدب لکھنے کی ترغیب دلائی۔ سرسید کے مشورے پر مولانا حالؔی نے ''مسدسِ حالی'' تحریر کی جسے ''مدوجزرِ اسلام'' کا درجہ حاصل ہے۔ سرسید کی صحبتوں سے مولانا حالؔی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' تحریر کی جو اُردو کی پہلی تنقیدی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا حالؔی اور محمد حسین آزاد کے توسط سے شروع ہونے والی ''نیچرل شاعری'' پر بھی سرسید کے مشورے ثبت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سرسید کے رفقاء نے نئی اَدبی اصناف کی آبیاری کی۔ مولانا حالؔی نے ''حیاتِ سعدی'' اور ''یادگارِ غالبؔ'' لکھ کر اُردو میں سوانح نگاری جیسی نثری صنف کا آغاز کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' لکھ کر اُردو میں ''ناول نگاری'' کی بنیاد رکھی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنے رفقاء کو اخلاص کے ساتھ اَدب کی پرورش اور نئی شعری اور نثری اصناف کی ایجاد و اِختراع پر توجہ دلائی۔ انھوں نے اُردو شاعری میں حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستانوں سے توجہ ہٹا کر مولانا حالؔی کو قوموں کے عروج و زوال کے واقعات کو شاعری میں پیش کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس طرح اُردو نثر اور اُردو شاعری میں نئی سمت سفر کرنے کا رجحان سرسید کی توجہ کا نتیجہ رہا۔

اُس دور کے بیش تر اُردو کے ادیبوں نے سرسید کے خیالات سے استفادہ کیا اور انھوں نے اپنی مرکزی حیثیت سے اپنے عہد کے ادیب، شاعر اور مورخین کو متاثر کیا۔ سرسید کے مشورے پر ہی محمد حسین آزاد نے ''دربارِ اکبری'' لکھ کر تاریخی شخصیات کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی طرف توجہ دی۔ اس طرح سرسید نے اپنے دور کے اَدیبوں کو اَدب کی بے شمار اَصناف اور مذہب کی صالح روایات کے علاوہ اخلاق و تہذیب کی پاسداری کی طرف مائل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے دور سے اُردو اَدب میں نئے انداز کے موضوعات کو شاعری اور نثری اصناف میں اختیار کرنے کا آغاز ہوا۔

آج کے دور میں پیدا ہونے والی نفرتیں، مذہب بیزاری اور اخلاق سوز حرکات کے بڑھتے ہوئے تناسب سے اَندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے اَدب میں سرسید کی طرح اصلاحات لانے کی شدید ضرورت ہے ۔ موجودہ دور کے اَدیب، شاعر اور مصنفین بھی سرسید اور ان کے رفقاء کی طرح اَدب ، مذہب اور اقدار سے وابستہ کارناموں کے احیاء پر توجہ دیں تو شائد رفتہ رفتہ سماج میں پھیلی ہوئی خرابیاں ختم ہو جائیں گی ۔

سرسید کا دور وہ سنہری دور تھا، جس میں مذہبی اقدار کی پاسداری کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی نے مذہبی خدمت کی بنیاد پر ''سیرت النبیؐ'' ، ''الغزالی''، ''الفاروق'' اور ''المامون'' جیسی کتابیں لکھ کر اپنے دور میں اَدب اور مذہب کے شعور کی بنیادوں کو مستحکم کیا ۔ آج کا دور بھی ان ہی تقاضوں کا منتظر ہے ۔ ایسے کارناموں پر توجہ دے کر تصنیف و تالیف کا حق ادا کیا جائے تو بلاشبہ عصر حاضر میں سرسید کے خیالات کی نئی تعبیر وجود میں آئے گی ۔

(۷) عالمی تناظر کی نمائندگی :

سرسید احمد خاں ہندستان کے بلاشبہ جدید افکار کے علم بردار تھے؛ جنھوں نے ملک میں عالمی تناظر کی نمائندگی کی، جس کی وجہ سے اختلاف کا وسیلہ بن گئے ۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کا تصور سب سے پہلے سرسید نے پیش کر کے اس پر عمل آوری پر توجہ دی ۔ انگریزوں کی طرح چھری کانٹے سے کھانے کی تربیت اپنے مدرسہ میں شروع کر کے معتوب ہوئے ۔ انگریزی اَدب میں ایسّے (Essay) اور انشائیے کے ذریعے ترغیب دلانے کا رجحان اُردو میں کیا اور شعور بیداری کی نمائندگی کو محسوس کرتے ہوئے انگریزی جریدے ''ٹیٹلر'' اور ''اسپکٹیٹر'' کے مماثل اُردو میں ایسّے لکھنے کی بنیاد رکھی ۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنے دور میں موجود عالمی تناظر کی نمائندگی کے لیے نہ صرف اپنی تحریروں میں عالمی افکار کو پیش کیا بلکہ اپنے رفقاء کو بھی اس جانب متوجہ کیا۔ اس دور میں انگریز قوم کے توسط سے ایجادات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ ہندستانیوں کو سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے انگریزوں نے پُل (bridges) بنائے ، ریلوے لائنس بچھائیں اور ٹرین سے سفر کے علاوہ بسوں کی بنیاد رکھ کر سفر کی سہولتیں فراہم کیں ۔

سرسید کے دور تک یونانی اور ہومیوپیتھی علاج موجود تھا ۔ لیکن انگریزوں نے ایلوپیتھی علاج کے ذریعے بھی بیماریوں سے شفا کا آغاز کر دیا ۔ اِن کارناموں سے متاثر ہو کر سرسید نے محسوس کیا کہ انگریز قوم چوں کہ انسانی بھلائی کے لیے کام کر رہی ہے اور اس نے روشنی کے لیے بجلی اور زمین کی کھدائی کی مشینوں کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں ہل جوتنے کے پرانے طریقوں کے بجائے جدید طریقے اختیار کر لیے ہیں ۔ اسی طرح پانی کو محفوظ کرنے کے ڈیم اور انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بے شمار ایجادات کو دنیا میں پھیلا دیا ہے ۔ ان تمام کارناموں سے واقفیت اور اُن کی اِفادی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے عالمی تناظر میں انگریزوں کی بڑائی کو تسلیم کیا اور اُن کی طرح ایجادات ، تعلیمات اور مشینوں

سے کارکردگی کو عام شہریوں تک پہنچا کر سرسید نے یہی کوشش کی کہ عالمی تناظر میں جس قوم نے انسانی بھلائی اور انسانیت کی خدمت پر توجہ دی ہے ۔ بلاشبہ اُن کے کارناموں سے استفادہ کرنا چاہیے۔

چناں چہ سرسید نے انگریزوں کی پیروی کا سلسلہ شروع کیا ۔جس پر کٹّر مذہب پرستوں نے انھیں نیچری، دہریہ اور نہ جانے کیا کچھ کہا۔لیکن ہندستانی قوم کی مادی ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے عالمی تناطر میں ترقی کرنے والی انگریز قوم کی برتری کو محسوس کیا اور اُن کے خیالات کی عکاسی اور ترجمانی کا حق ادا کیا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستانی معاشرہ مکمل طور پر انگریزی معاشرہ کی تقلید میں اُتر آیا ہے ۔ ہر انگریزی فیشن ہندستانیوں کی زندگیوں میں داخل ہوگیا ہے ۔ایسی صورت میں سرسید کی نئی تعبیر کے لیے انگریزی فیشن کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ، بلکہ جو فیشن ، جو دوائیں اور جن اشیاء کے استعمال سے مذہب پر حرف آتا ہے اور انسانیت کے گمراہ ہونے کا امکان ہے، عالمی تناظر میں اُن کی نفی کرنا عصر حاضر میں سرسید کے خیالات کی نئی تعبیر تلاش کرنے کے مماثل قرار دیا جائے گا۔

بلاشبہ سرسید احمد خاں اپنے عہد کے اِنتہائی عبقری انسان ہیں ۔ جنھوں نے مذہبی ، سائنسی ،تعلیمی، اَدبی ،سماجی اور معاشرتی سطح پر کام انجام دے کر دنیا کے لیے عظیم عملی مثالیں قائم کیں ۔ جو رہتی دنیا تک سرسید کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے کافی ہے ۔ تاہم ہندستان کی تاریخ میں یہ لکھا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہندستان میں خوبصورتی اور حسن کے معیار کو سمجھانے کے لیے شاہ جہاں نے جہاں تاج محل جیسی عمارت تعمیر کی ، اس سے زیادہ اہم کارنامہ انجام دیتے ہوئے سرسید احمد خاں نے تعلیمی درس گاہ ''علی گڑھ'' کی بنیاد رکھی ۔قوموں کی ترقی اور اُن کے کارناموں کے معاملے میں ہندستان کی تاریخ میں تاج محل سے زیادہ اہمیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دی جائے گی ۔ جہاں پر عالمی تناظر میں نئی نسل کو سجایا اور سنوارا جاتا ہے اور اُن کی تعلیم وتربیت کے ذریعے قوم و ملت کے مستقبل کو تابناک بنانے کا کارنامہ انجام دیا جاتا ہے ۔

سرسید کے قومی اور ملی کارنامے اِس قدر ہیں کہ جن کی تفصیل اور اُن کی نئی تعبیر کی نمائندگی کے سلسلے میں باضابطہ طور پر بھرپور کتاب لکھی جاسکتی ہے ۔لیکن عصر حاضر میں سرسید اور اُن کے کارناموں کی نئی تعبیر جیسے عنوان پر اپنے اس مضمون میں جو سات ذیلی موضوعات کے توسط سے اہم نکات کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے وہ تمام پہلو واضح ہوجاتے ہیں جو سرسید کی نئی تعبیر کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ سرسید جیسی شخصیتوں کے لیے خدائے سخن میرؔ نے بالکل سچ کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

محمد طاہر رومانی
سئیر صحافی۔حیدرآباد

دکن میں اُردو صحافت کا ارتقاء

سرزمین دکن میں یوں تو ماضی بعید یعنی اٹھارویں صدی سے ہی اردو ادب کی خدمت عام ہوگئی تھی ۔خصوصیت کے ساتھ دکن کی عظیم مملکت حیدرآباد میں قطب شاہی حکمرانوں کے بعد آصف جاہی فرمانرواؤں کی خصوصی دلچسپی اور سرپرستی کی بدولت اس وقت کے مشہور ادیبوں اور شعراء کی کثیر جنوبی ہند وغیرہ سے آکر یہاں بسنے لگی ۔علاوہ ازیں دکن کے شعراء' ادیبوں اور اہل علم اصحاب کی سرگرمیاں بامِ عروج پر تھیں ۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل سے اردو کے فروغ کے لئے مشاعروں کا آغاز ہوا۔جس کی سرپرستی نظام آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر نے کی ۔جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ اس کے علاوہ ریاست حیدرآباد کے اس وقت کے وزیراعظم کشن پرشاد (وہ بھی اردو کے شاعر تھے اور ان کا تخلص شآد تھا) پھر دیگر امرائے سلطنت نے بھی اردو کی خوب خوب خدمت کی ۔ایسے میں اردو کی ترویج واشاعت اور فروغ کے لئے ''اردو اخبار'' کی ضرورت محسوس کی گئی ۔چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے شہر حیدرآباد سے اردو اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔جن میں احوال عالم سے لیکر شہر کی دیگر سرگرمیوں کا احاط کیا جاتا رہا۔حیدرآباد کے علاوہ دیگر علاقوں اورنگ آباد 'ناندیڑ' پربھنی اور گلبرگہ وغیرہ جیسے اُردو مراکز اور پھر ریاست کے بعض اضلاع سے بھی اخبارات شائع ہونے لگے ۔البتہ شہر حیدرآباد کو صحافت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی ۔یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات کافی مقبول ہوئے ۔ان کی تفصیل یہاں پیش کرنا مشکل ہے۔اس لئے اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں اردو صحافت کی ابتدا 1859ء میں ہوئی ۔رسالہ طبابت کا اجراء عمل میں آیا۔قاسم علی سجن لال نے ''آفتابِ دکن'' کو حیدرآباد کا پہلا اخبار قرار دیا ہے جو قاضی محمد قطب کی زیرادارت 1960ء میں شائع کیا گیا لیکن سید انوارالحق نے اس دعویٰ کے ساتھ کہ دکن میں اردو صحافت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری 20'25 سال میں ہوئی ۔ انھوں نے 'خورشیدِ دکن' کو حیدرآباد کا پہلا اخبار کہا ہے جو 1877ء میں جاری ہوا۔جبکہ 1948ء میں حیدرآباد اسٹیٹ گزٹ شائع ہوا۔آفتابِ دکن کے بعد سلطان محمد عاقل دہلوی نے ہزار داستان اور مولوی حاجی کرتان نے شوکت الاسلام (ہفتہ وار) جاری کیا۔حیدرآباد کے اولین اخبارات میں آفتابِ دکن' خورشیدِ دکن اور ہزار داستان کے بعد سفیرِ دکن' افسرالاخبار' اخبارِ آصفی' جریدہ اعلامیہ' مشیرِ دکن (بانی ایڈیٹر کشن راؤ)

معارف (ملا عبدالباسط) روزنامہ علم وعمل (صادق حسین) رعیت' پیام' امروز (شعیب اللہ خاں) نظام گزٹ (حبیب اللہ رشدی اور وقار احمد) صبحِ دکن (احمد عارف' علی اشرف) مجلس (حکیم غفراللہ احمد انصاری)' وقت' منشور (عبدالرحمٰن رئیس) سلطنت (احمد اللہ قادری) مستقبل (عظیم الدین محبت) تعمیرِ دکن (فیض الدین) انقلاب (مرتضیٰ مجتہدی) محبِّ وطن (لچھی ریڈی) آواز (احمد عبدالقادر' مصطفیٰ قادری) آغاز (سید معین الحق) منزل (اظہر رضوی) ہمدم (مصطفیٰ قادری) اقدام (مرتضیٰ مجتہدی) نئی زندگی (جے این شرما) شعیب (انیس الرحمٰن) الاعظیم' چارمینار (سید نورالحق نور جعفری) اتحاد (عبدالقدوس ہاشمی' سلطان بن عمر) ماہنامہ رومان (مرتضیٰ مجتہدی) ہمارا اقدام (اسمٰعیل ذبیح) تازیانہ (اسد جعفری) انگارے (مرتضیٰ مجتہدی) پیسہ (سید احمداللہ قادری) وطن (راشد بیگ) امر بھارت (پورن چند شاکر) صداقت (وحید الحسن) ذبیح (اسمٰعیل ذبیح) حق بات (شیخ چاند) نویدِ دکن (عظیم عسکری) خون ناب (جی ایم عروج) شائع ہوئے۔ فرمان روائے وقت کے نام سے 1911ء میں عبدالحئی اور سید رضا شاہ نے ''عثمان گزٹ''۔ مولوی محمد اکبر علی نے 1912ء میں 'صحیفہ' اور 1920ء میں احمد محی الدین نے رہبرِ دکن جاری کیا۔ جو 1948ء میں بند ہوگیا۔ جب کہ منظور حسن انصاری نے رہنمائے دکن کے نام سے دوبارہ جاری کیا۔ قاضی عبدالغفار نے 1939ء میں پیام' غلام محمد اور حبیب اللہ اوج نے 1942ء میزان' علی اشرف نے 1942ء میں اتحاد' اظہر رضوی نے 1947ء میں جناح کی اشاعت کا آغاز کیا۔

بیساکھی کے دن 1923ء کو خوشحال چند جی نے اخبار ملاپ کا اجراء کیا جبکہ ملاپ 1948ء میں حیدرآباد سے جاری کیا گیا۔ اس سے قبل ملاپ ملک کے دو بڑے شہروں دلی اور جالندھر سے شائع ہوتا رہا۔ اس طرح ملاپ بہ ایک وقت تین اہم شہروں سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہونے لگا۔ خصوصیت کے ساتھ ملاپ نے اپنا ہفتہ وار ایڈیشن اردو زبان میں لندن سے شائع کیا۔ اس کا پہلا شمارہ 14 جولائی 1972ء کو جاری ہوا۔ اسی طرح زمیندار' پیسہ' وقت' ہمارا اقدام' انگارے' صحیفہ' سلطنت' خون ناب' نظام گزٹ' ہمارا عوام وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی میں سے رہنمائے دکن' سیاست اور منصف کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علاوہ ازیں اعتماد' راشٹریہ سہارا' صحافی دکن اور صدائے حسینی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ آزادی ہند کے بعد سے یوں تو بہت سے اخبارات شائع ہونے لگے۔ بہت سی وجوہات کی بناء پر بعض اخبار بند بھی ہوگئے۔ ان میں نظام آباد کا ماہنامہ گونج' ہفتہ وار خضر' کریم نگر کا مانیر اور محبوب نگر کا وینکٹ رام کا اردو ہفتہ وار مضافات (جو 1953ء میں جاری ہوا) اور جناب عبدالعزیز (مرحوم) کا تعمیر اور ورنگل سے ہفتہ وار نئی کرن (یہ اخبار اب بھی شائع ہو رہا ہے جس کو ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے)۔ پربھنی کا ہفتہ وار ندائے پربھنی' اورنگ آباد کے ایشیاء' ہندوستان' اورنگ آباد ٹائمز (یہ تمام روزنامے ہیں)۔ ناندیڑ کے روزنامہ سحر' ورقِ تازہ' تہلکہ ٹائمز' کامل یقین' بول چال اور نقوش' بیڑ کا تعمیر نو اور بمبئی کے انقلاب' ہندوستان اور اردو ٹائمز قابل ذکر ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عہدِ عثمانی میں اردو سرکاری زبان تھی جس کی وجہ سے اردو صحافت نے اردو زبان و ادب کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔نظام گزٹ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہاشم ملتانی کے کارٹون بھی شائع ہوتے جس سے اس اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔اسی طرح روزنامہ میزان کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اخبار تین زبانوں میں شائع ہوتا جو بڑی اہم بات تھی۔اردو میزان کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج تھے تو تلگو میزان کے اردی بابوراجو اور انگریزی اخبار مرزا عابد بیگ کی ادارت میں شائع ہوتا۔

روزنامہ سیاست دو دوست جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔1949ء میں شائع کردہ اس اخبار نے دیکھتے ہی دیکھتے قومی سطح کے معیاری اور مقبول اخبار کی حیثیت اختیار کرلی ۔اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ابتداءً صرف خبریں ہی شائع ہوا کرتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ادب کے فروغ کے لئے ادبی صفحہ میں بھی شائع کیا جاتا تھا۔لیکن چند برسوں سے بالخصوص جناب زاہد علی خاں کی ادارت میں شائع ہونے والے اس اخبار میں ہر روز ایک خصوصی ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے' جس میں طب' تاریخ' سیاست اور ادب سے متعلق ایڈیشن بھی شائع ہورہے ہیں اور بالخصوص مذہبی مضامین پر مشتمل ایڈیشن بھی شائع کیا جارہا ہے' جو روزنامہ سیاست کے بنیادی مقاصد میں ایک خوبصورت موڑ رہا ہے۔

رہبرِ دکن کی اشاعت کا آغاز جون 1920ء سے ہوا۔جس کا سلسلہ اشاعت 1948ء کے بعد بند ہوگیا۔ 1949ء میں جناب منظور حسن انصاری کی زیر ادارت رہنمائے دکن کے نام سے اس کا احیاء عمل میں آیا۔2 جولائی 1949ء کو پہلا شمارہ منظر عام پر آیا جو ہو بہو رہبر دکن کی کاپی تھا۔حیدرآباد سے شائع ہونے والے سب سے قدیم اس اخبار کا نام آزادی سے قبل رہبرِ دکن تھا جس کو جناب سید لطیف الدین اور جناب سید وقار الدین کے والد بزرگ وار جناب سید یوسف الدین (مرحوم) نکالا کرتے تھے۔جن کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے جناب سید لطیف الدین (مرحوم) پھر ان کے انتقال کے بعد اب جناب سید وقار الدین اس کے مدیر ہیں۔اس میں ہر دوشنبہ کو ادبی صفحہ کی اشاعت عمل میں آتی ہے جس میں ادبی مضامین اور مذہبی مضامین کے علاوہ شاعری کے کالم بھی ہوتے ہیں۔

جناب جعفر حسین جعفری کی زیر ادارت روزنامہ صدائے حسینی گذشتہ 10 سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ انگریزی خبروں کی ترسیل کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے صدائے حسینی نے اردو کے ساتھ ساتھ انگلش میں بھی خبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے جو منفرد بھی ہے اور مقبول بھی ہورہا ہے۔جس کے لئے جناب جعفر حسین مدیر اعلیٰ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات اور نئے زمانے کے تقاضوں کی تکمیل کے مطابق روزنامہ اعتماد بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔مجلس کا ترجمان ہونے کی وجہ سے ایک خاص حلقہ کا پسندیدہ اخبار بن گیا ہے۔اس کے علاوہ راشٹریہ سہارا کی مقبولیت میں بھی روز بہ روز اضافہ

ہورہا ہے۔

نظام دکن کے دورحکومت میں اورسقوط حیدرآباد کے بعدبھی یہاں صرف گنے چنے اخبارات شائع ہوتے تھے۔ حکومت وقت کی ایماء کے بغیر کوئی بھی خبر شائع نہیں کرسکتا تھا۔حتیٰ کہ پمفلٹ بھی چھاپنا محال تھا۔حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کوخبروں کی فراہمی اور ترسیل کا واحد ذریعہ جناب امام بیگ رونق کی قائم کردہ ایجنسی ''دکن نیوز سرویس'' تھا۔ تاہم بعد میں اوربھی خبررساں ادارے وجود میں آتے گئے ۔جیسے بھارت نیوز'انڈین نیوز' ماڈرن نیوز' پریس ایکسچینج 'وطن نیوز' تلنگانہ نیوز'اردو نیوز'اے۔این ۔ ایس'نیوزٹرسٹ'اورینٹ نیوز' کرنٹ نیوز وغیرہ وغیرہ۔جن کے ذریعہ حیدرآباد کی سیاسی' سماجی' ادبی اور مذہبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جاتا تھا۔جبکہ قومی اور بین الاقوامی خبروں کا ذریعہ پی ٹی آئی اور یواین آئی تھےاور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے ۔یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ ان اخبارات کی وساطت سے حکومت کے عوامی فلاحی اقدامات سے عوام کو واقف کروانے کے مقصد سے حکومت ہند کی جانب سے سرکاری خبررساں ادارہ ''پریس ٹرسٹ آف انڈیا'' (پی آئی بی) کا آغاز ہوا۔حیدرآباد میں اس کا علاقائی دفتر گذشتہ 50 سال قبل قائم کیا گیا۔پی آئی بی کی جانب سے اردو میں خبریں فراہم کی جاتی ہیں۔

سرکاری اعداد وشمار کے بموجب صرف حیدرآباد سے تقریباً30 تا40 اردوروزناموں کے علاوہ 200 کے لگ بھگ ہفتہ وار' ماہنامے' سہ ماہی اور دیگر میقاتی جرائد و رسائل شائع ہورہے ہیں۔ان میں سینئر صحافی ڈاکٹر فاضل حسین پرویز کی ادارت میں شائع ہونے والا ہفتہ وار ''گواہ''۔حکومت تلنگانہ کا ترجمان ماہنامہ ''تلنگانہ''(اردو)۔ اردو اکیڈیمی ریاست تلنگانہ کا ترجمان ''قومی زبان'' (ماہنامہ)اورممتاز شاعر جناب صلاح الدین نیّر کا ماہنامہ ''خوشبو کا سفر'' کا میں یہاں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کروں گا۔جواردوادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس کےعلاوہ ادبی حلقوں میں ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ''سب رس''۔زندہ دلان حیدرآباد کا ''شگوفہ' بھی خصوصیت سے پڑھا جاتا ہے۔

الکٹرانک اورسوشیل میڈیا کی یلغار کے باوجوداردو صحافت کےفروغ کا سلسلہ جاری ہے۔آئے دن اردو کے نئے اخبارات' میقاتی جرائد کی اشاعت کا آغاز ہورہا ہے۔اردوقارئین کی تعداد میں اضافہ بھی ہورہا ہے۔اگران اردواخبارات کوبھی سرکاری سرپرستی حاصل ہوتوان کی بہت سی مشکلات اور مسائل حل ہوسکتے ہیں۔کیونکہ بیشترچھوٹے اخبارات مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل کا شکار ہیں۔دوسری طرف حکومت اور پراؤیٹ کارپوریٹ اداروں کارویہ بھی اردواخبارات کے ساتھ نامناسب ہے۔ حکومت بھی صرف بڑے اخبارات کوہی مالی فوائد پہونچارہی ہے۔اس سلسلہ میں ہماری تجویز ہے کہ حکومت بلاامتیازاور کسی بھید بھاؤ کے بغیرتمام اخبارات کے ساتھ تعاون کرے کیونکہ ویلفیر گورنمنٹ کا یہی اصول بھی ہے۔

☆☆☆

شجاعت علی شجیع
ریٹائرڈ آئی آئی ایس

اقبالؔ کے نغمات میں آیت کی جھلک ہوں

سارے عالم میں اگر کسی خطہ نے اُردو زبان کی حقیقی خدمت کی ہے تو سرزمین حیدرآباد دکن کے علاوہ کوئی نہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں علم وفن اور شعر وادب ہمیشہ پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ اُردو کے حوالے سے یہاں کا ماضی ، حال اور مستقبل انتہائی روشن ہی روشن ہے۔ جاگیردارانہ ماحول ،فنون لطیفہ کی ترقی اور فروغ کے لئے ہمیشہ ہی سازگار رہا۔ فنون لطیفہ میں ادب اور ادب میں شاعری کو ہمیشہ سے ہی ایک خاص مقام حاصل رہا۔ سابق ریاستوں کے تمام حکمرانوں نے اُردو کو بے انتہا چاہا اور اس کی مقبولیت کو چار چاند لگانے کے لئے اسے دیوانِ خاص سے دیوانِ عام تک عام کیا۔ یہی وہ راز کی بات ہے کہ بادشاہی دور کے ختم ہونے کے باوجود اُردو عوام کے دامن سے ایسے لپٹی ہوئی ہے جیسے جسم میں روح ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے قدیم مشاعرے جو ایک مخصوص انداز لئے ہوئے تھے اور یہاں پر خواص ہی سامعین ہوا کرتے تھے لیکن چونکہ اُردو زبان عوام میں مقبول ہوچکی تھی اسی وجہ سے جاگیردارانہ نظام کے ختم ہوجانے کے باوجود اُردو کے مشاعرے آج بھی اپنی ساری آب وتاب کے ساتھ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ حال کے حیدرآباد کے ساتھ ان کا ایسا گہرا رشتہ ہے جو ٹوٹے سے نہ ٹوٹے۔ یوں تو حضور نظام بھی شاعری فرماتے تھے لیکن جو شہرت حضرت شجیع یعنی والا شان پرنس معظم جاہ بہادر کو ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ حضرت شجیع کو شاعری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنی قلبی کیفیت کو انتہائی مناسب الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔ ان کا اظہار اتنا متاثر کن ہوتا تھا کہ سننے والوں پر ایک کیف چھوڑ جاتا۔

حضرت شجیع کی ساری کی ساری غزلیں خوبصورت بیانی اور ادبی محاسن کی آئینہ دار ہے۔ جس مخصوص کیفیت میں وہ شاعری کرتے اس کا اثر انتہائی خوبصورت انداز میں سامعین پر پڑتا۔ شاعری میں اتنا عظیم مقام جگرسوزی کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ حضرت شجیع کو زبان اور بیان پر مکمل عبور حاصل رہا۔ یہی وہ وجہ ہے جس کے سبب ہر قاری آپ کو اپنے دل میں پاتا ہے۔ آج کے حیدرآبادیوں کو حضور نظام کے زمانے کے مشاعروں کا کوئی علم نہیں ہوگا لیکن حضرت شجیع کے فرزند ارجمند پرنس شہامت جاہ کے دولت خانے پر منعقد ہونے والے

مشاعروں سے کچھ حد تک یہ احساس ہوتا ہے کہ ہاں حضور نظام کے زمانے میں بھی اسی انداز کے مشاعرے منعقد ہوتے رہے ہوں گے۔

پرنس شہامت جاہ ان مشاعروں میں اپنا تازہ کلام بڑے خلوص کے ساتھ سناتے ہیں۔ حضور نظام عثمان علی خان نے ہندوستان بھر کے موسیقاروں، فنکاروں اور شاعروں کی بھرپور سرپرستی کی۔ داغ دہلوی رامپور سے حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے لیکن 10 سال تک بھی ان کو سرکار عالی سے کوئی وظیفہ نہ مل سکا۔ جب حضور نظام کو اس بات کا پتہ چلا کہ انہیں اتنے بڑے عرصہ تک وظیفہ ادا نہیں کیا گیا تو انہوں نے 10 سال کا پورا معاوضہ فی الفور ادا کرنے کا حکم دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں نوٹ نہیں ہوا کرتے تھے' سارا معاوضہ چاندی کے سکوں کے ذریعہ دیا گیا جس کے لئے ایک بنڈی کا استعمال کرنا پڑا۔

دنیا کی ہر زبان میں شاعری ہوتی ہے لیکن اُردو زبان کی شاعری تمام زبانوں پر بھاری ہے۔ زبان کی ندرت، نزاکت، تاثیر اور بیان اُردو زبان میں جس حسین انداز میں ہوتا ہے دوسری زبانیں اس کی سطح پر آنے سے قاصر ہیں۔ اُردو شاعری میں دلی کیفیت اور روحانیت اس قدر موثر بیان ہوتا ہے کہ جس کو عام زبان میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اُردو شاعری احساس کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو محسوس بھی کی جاتی ہے اور اس کی تاثیر بھی دل کو چھونے لگتی ہے۔ حقائق کو موزوں الفاظ میں بیان کرنے کا ملکہ صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو تصورات کو بھی اک شکل دے سکتی ہے۔ ایک عام بات کو بھی ڈرامائی انداز میں پیش کرنا اُردو زبان کا خاصا ہے۔ ویسے شاعری تو آفاقی ہوتی ہے یہ کسی زبان، علاقہ یا کسی خاص خطہ تک محدود نہیں ہوتی جو بات اُردو کے ایک مصرعہ میں کہی جاسکتی ہے وہ بات دوسری زبانوں کے دس سطور میں بھی واضح کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ حیدرآباد میں مقیم نہ رہنے کے باوجود مرزا غالب اور علامہ اقبال کو حیدرآباد سے بے حد رغبت اور محبت رہی۔ اس دور کے حیدرآبادی اُردو شاعروں نے بھی ان سے بہت کچھ سیکھا۔ حیدرآباد میں ایسے بہت سے شاعر گذرے ہیں جنہوں نے علامہ اقبال پر اور مرزا غالب پر سیر حاصل تحقیقات کیں اور یہی وہ وجہ تھی جس کے سبب ان کو ماہر اقبالیات اور ماہر غالب کہا جاتا ہے۔

بہرحال حیدرآباد کے مشاعرے اور ادبی محفلیں بڑی ہی شائستگی کے ساتھ منعقد ہوتی رہی ہیں۔ کس کس شاعر کا ذکر کیا جائے یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن ہم حضرت شجیع شاعری کا سرسری جائزہ لیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک مکمل شخصیت ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ آپ کا شاعری کا انداز بالکل انوکھا اور دل کو چھو لینے والا رہا۔ آنکھوں میں اشک اور لبوں پر ہنسی کو وہ جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہمیشہ ایک نئے انداز سے یاد آپ کی آئی
کبھی آنکھوں میں اشک آئے کبھی لب پر ہنسی آئی

ایک اور شعر میں ترک محبت پر ان کا ہنسنا کتنا حسین ہے

دیکھئے:

شجیع آیا جو ان سے تذکرہ ترک محبت کا
انہیں بھی کچھ ہنسی آئی ہمیں بھی کچھ ہنسی آئی

ایک چھوٹی سی بحر کا شعر کتنا متاثر کن ہے، دیکھئے گا:

جو کلی مسکرائی وہ مرجھا گئی
زندگی کی حقیقت نظر آ گئی

سرد آہوں کو اور زخموں کو وہ کس طرح آباد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سرد آہوں نے میرے زخموں کو آباد کیا
دل کی چوٹوں نے جو رہ رہ کے تجھے یاد کیا

وہ اپنی بربادی کے احساس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

خود مجھے بھی نہیں بربادی کا احساس شجیع
اس سلیقہ سے کسی نے مجھے برباد کیا

شجیع غم میں آنسو بہانے کو آسان سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں:

بہت سہل ہے غم میں آنسو بہانا
مگر مسکرانا کچھ آساں نہیں ہے

عشق اگر بیان نہیں ہوتا ہے تو اسے عبادت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو اپنے ایک شعر کے ذریعہ وہ کس طرح بیان کرتے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔

کون سمجھے میری محبت کو
راز ہوکر ہوں راز داں سے جدا

ooo

حضرت شجیع کو حکومت کے جانے کا بے حد غم رہا اور اپنے اس غم کا وہ کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں:

کل اسی گھر کے مکیں ہم تھے شجیع
آج مہمان بنے بیٹھے ہیں

محبت میں آدمی کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کو حضرت شجیع کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:

دل جانتا ہے دل کا مقدر ہے درد عشق
درماں تو کیا تصور درماں نہ کیجیے

آج کے حیدرآباد کے مشاعروں میں شنکر جی مشاعرہ اور ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ (جو آج کل منعقد نہیں ہو رہا ہے) قابل ذکر ہے۔ مزاحیہ مشاعرہ بھی حیدرآباد کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اور سماج درپن کے مشاعرے اپنے سامعین کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ نمائش میدان میں 1980 میں منعقدہ شنکر جی کا مشاعرہ اندرجیت سنگھ تلسی نے لوٹ لیا تھا۔ ان کا یہ بند مشاعرہ کو لوٹنے کا سبب بنا:

میرے مالک میری بخش دینا خطا
پھول پوجا کے تجھ پر چڑھا نہ سکا
ہاتھ بندوں کی خدمت میں مصروف تھے
ہاتھ خالی نہ تھے بندگی کے لئے

بہرحال حیدرآباد فرخندہ بنیاد برسوں سے اُردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج تلنگانہ کے لگ بھگ سبھی ضلعوں میں مشاعرے ہو رہے ہیں۔ ماضی میں بھی ان اضلاع میں مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔

حیدرآباد میں ایک درجن سے زیادہ ایسی کچھ تنظیمیں بھی ہیں جو ہر ماہ مشاعروں کا اہتمام کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع والی

حیدرآباد کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول سے 33واسطوں اور 17 واسطوں سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے۔آپ کا خاندان علم وفضل، خدمت خلق، شرافت، رواداری، اعلیٰ اخلاق وصفات اور عدل وانصاف میں شہرت رکھتا ہے۔ بڑے گھرانے کے وارث ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت میں غرور وتکبر کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔آپ ایک کامیاب حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔شاعری میں بھی عثمان تخلص فرماتے تھے۔آپ کا گھر بار، علماء، دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور اہل کمال شخصیتوں کا مرکز تھا۔ارسطو جاہ کے علاوہ امیر، کبیر، شمس الامراء، امیر پائیگاہ اور مہاراجہ چندو لال اور مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کی اُردو دوستی اور شعراء کی سرپرستی سے بھی دکن کی سرزمین علم وفن اور تہذیب وتمدن اور رواداری کا مرکز بنی رہی۔

نظام کا دور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک حسین امتزاج تھا اور اُردو شاعری میں بھی اُس کی صاف جھلکیاں دکھائی دیتی ہے۔بہرحال اُردو زبان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے تسنیم جوہر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

چکبست اور فراق کے ماتھے کا تلک ہوں
اقبال کے نغمات میں آیت کی جھلک ہوں
دوہوں میں کبیر کے محبت کی مہک ہوں
کیوں مجھ کو کہہ رہے ہو کہ میں مسلمان ہوں
ہندوستان کی شان میں اُردو زبان ہوں

☆☆☆

امام غزالیؒ فرماتے ہیں

☆ سب انسان مردہ ہیں
☆ زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے اقوال

☆ درویشی پردہ پوشی کا نام ہے-
☆ دنیا والوں کی صحبت فقیر کے دل کو پریشان کردیتی ہے۔
☆ دنیا کی حرص، غم فردا، حسد وبغض اور حب جاہ جس دل میں ہو وہاں حکمت قرار نہیں پکڑتی۔
☆ جو بلا دوست کی جانب سے نازل ہو اس کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔
☆ جس کی آنکھ میں عشق کا سرمہ لگا ہو اس کی نظر میں عرش سے تخت تک کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔
☆ خدا کا خوف بے ادب بندوں کے لئے تازیانہ ہے تاکہ وہ اس کے سبب گناہوں سے بچے رہیں اور نیک راستہ پر قائم رہیں۔

انسان کے بارے میں الخوارزمی کا انوکھا حساب

جب انسان کے پاس صرف اخلاق ہوں تو کُل نمبر	1
ساتھ خوبصورتی بھی ہو تو دائیں طرف صفر بڑھادیں	10
ساتھ مال ودولت بھی ہو تو ایک صفر اور بڑھادیں	100
ساتھ حسب نسب بھی ہوں تو ایک صفر اور بڑھادیں	1000
اگر یہ سب ہوں اخلاق نہ ہوں تو ایک کو ہٹادیں	000

تو باقی بچے گا۔۔۔۔ (0)

oOo

ڈاکٹر یم۔نظام الدین
لکچرار نلگنڈہ گورنمنٹ کالج ،نلگنڈہ ،تلنگانہ
Pin 508001

تین ادبی تحریکیں اور اُن کی ادبی معنویت

اُردو ادب میں نئے رجحانات کی داغ بیل ہمیشہ کسی نہ کسی تحریک کا نتیجہ رہی ہے ۔میرؔ و غالبؔ کے دور تک کلاسکی نظریات کی بھرمار تھی ۔کلاسیکیت نے زبان وادب کو فائدہ پہنچایا' تخلیقی فکر کو اعتدال کی راہ پر رکھا' موضوع اور مواد کو فلسفیانہ رنگ دیا' معنی ومفہوم تک رسائی کے لئے الفاظ کے تعین کا سلیقہ عطا کیا۔ اس کے خلاف رومانیت کو فروغ ہوا۔رومانیت دراصل پرامن اور پرنشاط دور کی یادگار سمجھی جاتی ہے ۔یہ ایک ایسی تصوراتی دنیا تخلیق کرنا چاہتی ہے جہاں خواب آگیں ماحول ہو اور انسانی جذبہ کے اظہار پر پابندیوں کے پہرے نہ ہوں ۔کلاسیکیت اور رومانویت کے اثرات ادب کے ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں ۔کبھی کلاسیکیت ، رومانیت پر غالب آجاتی ہے تو کبھی رومانیت کلاسیکیت اثرات کو کم کرتے نظر آتی ہے۔

میرؔ اور غالبؔ کے دور کے رجحانات سے آگے بڑھیں تو اُردو ادب کی جن بڑی اور عظیم تحریک کا سامنا ہوتا ہے وہ سرسید کی علی گڑھ تحریک ہے۔ یہ تحریک ایک ایسی سیاسی وسماجی اصلاح کی تحریک تھی جس نے بالخصوص مسلمانوں کو ذہنی پستی اور معاشی بدحالی سے نکال کر نئی تعلیم اور بدتہذیبی قدروں سے ہم کنار کرنے کا کارنامہ انجام دیا ۔اس کے لئے سرسید نے ایم ۔اے ۔او کالج علی گڑھ گزٹ' سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کو ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا۔کالج کے قیام کا اہم مقصد مسلم نوجوانوں کو انگریزی زبان وعلوم سے آراستہ کرنا اور یہاں کے فارغین کو سرکاری ملازمتوں کے حصول کے قابل بنانا تھا۔جس میں سرسید کی کوششیں بہت حد تک رنگ لائیں ۔ اس کالج کے فارغین نے انگریز سرکار میں عہدے حاصل کئے اور جنٹل مین بھی کہلائے ۔لیکن اس کے ثمرات غریب طبقے تک نہ پہنچ سکے۔اس لئے بھی کہ اس کالج میں خوش حال خاندانوں کے لڑکے ہی جدید تعلیم حاصل کیا کرتے تھے ۔علی گڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے اور نئے افکار ونظریات سے قریب کرنے کی سعی کی۔انگلستان سے آکر ۱۸۷۰ء میں جب انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا تو ان پر انگریزی تہذیب اور کلچر کا اثر اور وہاں کی تعلیمی سائنس اور معاشی ترقی کا شدید احساس کام کررہا تھا۔وہ بھی چاہتے تھے ملک کے نوجوان بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور یہاں بھی سائنسی معاشی ترقی کی راہیں ہموار ہوجائیں۔چنانچہ تہذیب الاخلاق کو علی گڑھ تحریک کا نمائندہ

اخبار سمجھا جانے لگا جس میں سرسید کی مذکورہ فکر کو سرسید اوران کے رفقاء مضامین کے ذریعہ نمایاں کیا جاتا تھا۔اس سے سرسید کا مقصد قوم کی تعلیمی سماجی اور معاشی ترقی تھا۔ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کا کام بھی اسی اخبار سے لینا چاہتے تھے۔لیکن اس کے مذہبی افکار کو مسلمان کے کسی طبقے نے بھی قبول نہیں کیا۔ہر چند ان کے تعلیمی ،سماجی ، اورادبی رجحانات نے مقبولیت حاصل کی۔ان کا ادبی سرمایہ ان کی انشاء اُن کا طرز بیان اوران کی مقالہ نگاری اُردو زبان وادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

علی گڑھ تحریک سرسید کے ساتھ ان کے چند ہم خیال ادیبوں شاعر دانشوروں اور چند ہمدردان قوم کا ایک اجتماعی عمل ہے جنہوں نے قوم کی سماجی، تعلیمی اورادبی اصلاح کے لئے سر جوڑ کر کام کیا۔سرسید اس تحریک کے علمبردار تھے انہوں نے علمی امور کے انجام دینے کے لئے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا، کئی سائنسی علوم کی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کروایا۔سرسید کی تعلیمی اوراصلاح کی کوششوں کا اثر سارے ملک میں نظر آنے لگا۔اس کے ساتھ ہی زبان وادب پر ان کے اوران کے رفقاء کے خیالات کا گہرا اثر پڑا جو قدیم فلسفہ حیات سے مختلف تھا۔ان کے یہاں ماضی کے مقابل مستقبل کی اہمیت زیادہ تھی۔حقیقت نگاری اورادب برائے زندگی کا تصور زیادہ روشن تھا۔ادب میں اسلوب بیان اورروح مضمون پر زور حرف کیا جانے لگا۔نظم ونثر میں کئی کئی اصناف کا اضافہ ہوا۔ شعری اصناف میں خاص طور پر نظم اورجدید مثنوی نے بار پایا تو نثر میں، ادبی تاریخ، سوانح عمری مضمون نگاری، انشائیہ اور ناول نگاری نے جگہ بنائی۔غرض ان ساری کوششوں اور کاوشوں کے اثرات وقت کے ساتھ نئی اُبھرنے والی تحریکوں کی راہیں روشن کرتے نظر آتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے بعد اُردو ادب میں جس تحریک نے بھرپور سرگرمی اور توانائی کے ساتھ انقلابی تبدیلیوں کا کارنامہ انجام دیا وہ ترقی پسند تحریک ہے۔اس تحریک کے انقلابی افکار و نظریات نے ملک کی تقریباً تمام اہم زبانوں کو متاثر کیا۔ علی گڑھ تحریک کے رونما ہونے میں جن سیاسی اور سماجی حالات کو دخل تھا، وہ ۱۹۳۶ء تک پہنچتے پہنچتے یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا شعور جہاں ہندوستانی لیڈروں کی دین تھا وہیں یورپ میں جو معاشرہ کے خلاف اشتراکی افکار ونظریات عام ہو رہے تھے ان سے ہندوستانی عوام بے خبر نہ تھے، خاص طور پر وہ نوجوان جو اِن دنوں لندن میں مقیم تھے۔ ان نوجوانوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا۔ان افسانوں میں مروجہ اخلاقی، مذہبی اور سماجی قدروں کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ان ہی نوجوان نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لایا جس کی ہر ماہ ایک دو ادبی نشستیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔لندن میں مقیم ان ہندوستانی نوجوانوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ وطن سے دور رہ کر ہندوستانی سماج اور وہاں کی زبانوں کے ادب میں تبدیلی نہیں لا سکتے، چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ملک آ کر پھر ایک مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لایا جس کے اہم مقاصد میں (۱) ترقی پسند افکار ونظریات کو جو بہت حد تک مارکسی اور

اشتراکی تھے' عام کرنا (۲) ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا (۳) ملک کی آزادی اور سماجی بہبود کے لئے جدوجہد کرنا (۴) اہل قلم افراد کے مفاد کی حفاظت کرنا (۵) اظہار خیال کی آزادی کو حکومت سے منوانا (۶) ترقی پسند مصنفوں کی کتب کی اشاعت میں مالی مدد کرنا وغیرہ شامل تھے۔ ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کانپور میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی اور خطبہ صدارت میں انجمن کے نام اور مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس تحریک کو ملک کی اہم سیاسی سماجی اور ادبی شخصیتوں کا تعارف حاصل ہوا۔ اس تحریک نے اردو زبان وادب کے ساتھ ملک کی اہم زبانوں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۲ء تک یعنی کل بیس سال میں تحریک نے اُردو زبان وادب کے علاوہ ملک کی اہم زبانوں کے ادب میں اور سماج میں فکر ونظر کی تبدیلی ہے اور اس کی وجہ جو ادب وتخلیق پایا وہ سرمایہ افتخار ہے۔

ترقی پسند تحریک نے انسانی زندگی کی اہم ضرورتوں روٹی، کپڑا اور مکان پر زور دیا۔ کسانوں مزدوروں اور پچھڑے طبقات کی زندگی' جذبات ومسائل کو ادب کا موضوع بنایا۔ اشتراکی نظام کی تائید کی اور اس کے قیام کی اہمیت پر زور دیا۔ بھوک افلاس' سماجی پستی اور غلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جمہوریت پسندی کو فروغ دیا تو سرمایہ دار لوٹ کھسوٹ اور جاگیردارانہ ٹھاٹ باٹ کا غرور توڑ دیا۔ اردو کا ترقی پسند ادب نظم ہو کہ نثر اپنی موضوعات کا نمائندہ ہے۔

ترقی پسند تحریک کو اس کے اعلان نامے کے پیش نظر مارکسی نظریات کا پروپگنڈہ قرار دیا گیا اور بعض افراد کی جانب سے یہ تصور دیا جانے لگا کہ ترقی پسند ادب مارکسی نظریات کا منیفسٹو بن کر رہ گیا ہے۔ یہ بات پوری طرح غلط بھی نہیں تھی اس لئے کہ اس تحریک کا بنیادی نقطہ نظر ہی یہ تھا کہ ادیب ہو کہ شاعر پرولتاوری طبقے کا ہمدرد ہو اور اپنی تخلیقات میں طبقاتی جدوجہد کے اثرات کو نمایا کرے۔ اس لحاظ سے ترقی پسند تحریک ایک کامیاب تحریک تھی جس نے اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک اپنے ایک معینہ لائحہ عمل کے مطابق سماج میں معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مخالفت میں نظریاتی اختلاف بھی سامنے آنے شروع ہوگئے۔ حلقہ ارباب ذوق نے تخلیقی عمل کی راہوں کو ترقی پسند تحریک کے لائحہ عمل تک محدود رکھنے کو گوارا نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جو ادب کسی لائحہ عمل کا تابع ہوتا ہے وہ انسانی تجربے کی ہمہ گیری اور اس تجربے کی طویل المدت اثر انگیری کے فنی اظہار سے قاصر رہتا ہے۔ یہیں سے جدیدیت کی راہ ہموار ہونے لگتی ہے۔

جدیدیت ادب میں اخلاق کو مصنوعی طریقے سے داخل کرنے کے خلاف ہے۔ اس کے نزدیک ادب اخلاق سے زیادہ با اخلاق شئے ہے۔ مصنوعی طریقے سے جن اخلاقی اقدار کو مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ قدریں انسانی وجود کا فطری عنصر نہیں بن سکیں۔ اس لحاظ سے جدیدیت ایک وسیلہ سمجھی گئی انسانی ذہن اور حواس کو متحرک رکھنے' انفرادیت کو زندہ رکھنے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کو جاری رکھنے کا۔ جدیدیت میں ادب اور شاعروں کو مذہب کا نعم البدل نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے

''تشکیک'' جدیدیت کا فلسفہ نہیں بلکہ یہ نئے انسان کی تجرباتی صداقت ہے۔جس نے حقیقت پسندی کے دائرے کو وسیع کیا ہےاورانفرادیت کوزندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔اس طرح جدیداردوادب میں تیسری بڑی تحریک ہے جس نے شعروادب کا رخ تبدیل کرنے اور نئے افکارونظریات سے شعروادب نیا رنگ دینے کی سعی کی ہے۔اگرادب کی ان تین تحریکوں کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تینوں تحریکیں اپنی اپنی معاصریت کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ایک تحریک دوسری تحریک کے کوکھ سے جنم لیتی نظر آتی ہے۔جیسے علی گڑھ تحریک نے ادب برائے ادب کے نظریے سے ہٹ کرادب برائے زندگی کی تائید کی۔اس نے غفلت پر زور دیا۔ تخیل کی سنہری وادیوں سے نکال کرادیبوں اورشاعروں کوحقیقی دنیا کی سیر کرائی۔اپنے اطراف کا جائزہ لینے پر مائل کیا ادب کوفرد کا آئینہ بننے سے بچا کر اجتماعی زندگی کا شعورعطا کیا۔ کلاسیکیت اوررومانویت کی سختیوں اور پابندیوں سے آزادکیا۔ فلسفہ،تصوف اورعشق حقیقی ومجازی کے موضوعات سے دامن بچاکر نئے علوم کی تعلیم اورحقیقت پسندی کے رجحان پر زوردیا۔انگریزی ادب اورکلچر سے استفادہ کانظریہ دیا۔اسی کا ہی اثر تھا کہ ہندوستان سے کئی نوجوان اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے لندن اور یورپ کے دیگر ممالک کا رخ کرنے لگے بیسویں صدی کے ربع اول میں دنیا کے ساسی اورسماجی منظر نامے بڑی بڑی تبدیلیاں دکھائی دینے لگیں دوبڑی جنگوں کے اثرات نے ظلم واستبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا شعور عام کیا چنانچہ فاشزم کے خلاف اشتراکی نظریات نے جنم لیا کیمونزم اورسوشلزم کوفروغ ہوا۔انقلاب روس نے جومثال قائم کی تھی' اس نے غلام ملکوں میں ذہنی بیداری کی لہردوڑادی۔ ہندوستان میں حصول یا آزادی کے لئے جوجدوجہد جاری تھی اس میں بھی ایک نیاجوش پیداہوا۔وہ نوجوان جواعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے'سوشلسٹ اورمارکسی نظریات سے قریب ہورہے تھے انہوں نے اپنے ملک ہندوستان میں سماجی اورسیاسی انقلاب لانے کاارادہ کرلیا۔ان نوجوانوں نے اپنے نئے افکارونظریات سے جہاں جدوجہدآزادی کوقوت بخشنا شروع کیا تو وہیں سماجی اصلاح کے طور پر سرمایہ دارانہ اورجاگیردارانہ نظام کی جڑیں بھی اُکھیڑ پھینکیں۔اورمیں یہ کام ترقی پسند مصنفین نے تحریک کے بیس سالہ دورمیں انجام دیا۔جب اس تحریک کا خاتمہ ہوگیا تو بعض دانشوروں نے ترقی پسندی کو ایک ایسا عمل قراردیا جوہردورمیں جاری وساری رہتا ہے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند تحریک اگرچہ ختم ہوگئی ہےلیکن ترقی پسند کاعمل ہمیشہ جاری رہنے والاعمل ہے جوجاری رہے گا۔اسی تصور نے جدیدیت کوجنم دیا۔تجدد پرستی کا تصوراول وآخراپنے زمانی رشتوں کا پابند ہےاوراس اعتبارسے ہروہ رویہ جوزندگی کی پرانی قدروں سے گریزاورنئی قدروں کی جستجو کا پتہ دیتاہے جدید ہے۔باالفاظ دیگرجدیدیت وقت کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کے قبول کرنے کا نام ہے جنہیں اس دورمیں قبولیت عام کا شرف ہوجائے۔اس طرح اُردوکی ان تین ادبی تحریکوں میں افکارونظریات کے تدریجی ارتقاء کی جومنزلیں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ دراصل ان تحریکوں کی ادبی معنویت کی دلیل ہیں۔

☆☆☆

محمد طارق
مطالعات ترجمہ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

8-1-523/145/1
گراؤنڈ فلور، برنداون کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد

کیا ادبی ترجمہ ممکن ہے؟

فن ترجمہ یا ترجمہ نگاری بلا شبہ ایک مشکل فن ہے۔ اس میں بھی سب سے مشکل کام ادبی ترجمہ ہے کیونکہ اس میں صرف متبادل الفاظ ہی کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ شعر وادب کی تخلیقی روایات اور تاریخی پس منظر سے واقفیت بھی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ادب سراسر وجدان سے عبارت ہوتا ہے، اس لیے تخلیقی ادب کے تراجم میں وجدانی کیفیت کا شامل ہونا ضروری ہے اور جذبات کا ترجمہ میکانیکی عمل سے بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی ادب کے تراجم کو ماہرین نے ایک مشکل امر سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے شعر وشاعری کے ترجمے کو اس شاخ سے تعبیر کیا ہے جسے چھوتے ہی اہل علم کی انگلیاں جل جاتی ہیں۔

دراصل ترجمے کے عمل میں یہ بحث بہت ہی قدیم ہے کہ آیا ادب کا ترجمہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں موافق و مخالف دونوں نظریات کے حاملین موجود ہیں۔ دونوں نے اپنے موقف کی تائید میں اس موضوع پر الگ الگ انداز سے گفتگو کی، اپنے اپنے نظریات اور نقطۂ ہائے نظر پیش کیے اور ان کو ثابت کرنے کے لیے مضبوط دلائل پیش بھی کیے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے وہ یا ان کی آرا اپنی آخری انتہا پر ہیں۔

جو لوگ ادبی ترجمے کے امکان کی حمایت کرتے ہیں ان کی اہم اور بنیادی دلیل ترجمے کی سرگرمی ہے۔ اپنے نظریے کے اثبات میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ زبانوں کا لسانی تعامل ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔ زبانیں ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ کرتی ہیں، دوسری زبانوں کے اندر موجود علمی، مذہبی اور ادبی ہر قسم کے سرمایے کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ کسی بھی زبان کا بہترین سرمایہ صرف اسی زبان کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو، تہذیبی خلیج میں کمی واقع ہو، نئے نظریات و افکار سے واقفیت کا موقع ملے، دوسری زبان کے رجحانات، تخیلات، مزاج نیز لسانی خوبیوں سے اپنے اندر مزید وسعت پیدا کی جائے، نئی ادبی اصناف کا اضافہ ہو اور دیگر زبانوں کے فنی معیارات سے واقفیت کا موقع نصیب ہو۔ چنانچہ شیکسپیر کی تخلیقات کا دنیا کی بہت ساری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ غالبؔ کی آفاقی شاعری صرف اردو تک ہی

محدود نہیں ہے۔ موپاساں فرانسیسی اور چیخوف روسی ادب کی ہی جاگیر نہیں رہے۔

اردو زبان اس معاملے میں بہت فائق نظر آتی ہے۔ یہاں ادبی ترجمے کی جانب بہت توجہ دی گئی، بے شمار مترجمین نے دلجمعی و دلچسپی کے ساتھ اس کار دشوار کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ یہاں تک کہ مذہبی کتب جو ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں ان کے نہ صرف نثری ترجمے ہوئے بلکہ منظوم تراجم بھی خوب کیے گئے۔ بھگوت گیتا اور رامائن کے علاوہ قرآن کریم جو کہ عربی ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے سب کے معیاری منظوم ترجمے ہوئے جن میں سیماب اکبر آبادی، کیف بھوپالی اور شان الحق حقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگریزی سے اردو میں ادبی تراجم کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے کیا، جس کا سلسلہ انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا، بیسویں صدی، خاص طور پر اس کے ربع اوّل میں تراجم کو بے حد فروغ ملا۔ تراجم کو مقبول بنانے میں اس عہد کے ادبی رسائل نے بھی اہم کردار ادا کیا، جن میں ''مخزن''، ''دکن ریویو''، ''افادہ''، ''تمدن''، ''تجلی''، ''ادیب''، ''زمانہ''، ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' متعدد انگریزی نظموں کے ترجمے شائع کرنے میں پیش پیش رہے۔ مترجمین میں علامہ اقبال کے علاوہ ضامن کنتوری، عزیز لکھنوی، ظفر علی خان، غلام نیرنگ، حسرت موہانی، علی حیدر زیدی، غلام محمد طور، صادق علی کشمیری، شاکر میرٹھی، تلوک چند محروم، طالب بنارسی، محمد شفیع اور کرشن چندر کے نام مشہور و معروف ہیں۔ یہ تمام کاوشیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ادب کا ترجمہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کی بہت قدیم و روشن روایت چلی آرہی ہے۔ مرزا حامد بیگ کی کتاب ''مغرب سے نثری تراجم'' اور حسن الدین احمد کی ''ساز مشرق'' اور ''ساز مغرب'' میں اسی روایت کو مدون کیا گیا ہے۔ تقریباً تمام غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبانوں کی صورت حال کم و بیش یہی ہے، ترقی یافتہ زبانوں میں دوسری زبان کے ادب کے ترجمے پر کم توجہ مرکوز کی جاتی ہے لیکن ایسا صرف ادب کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ وہاں تمام علوم کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔

ادبی ترجمے کے مخالفین کا یہ کہنا ہے کہ کسی بھی زبان کا ادب اس زبان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتا ہے۔ زبان کی تمام تر نزاکتیں، باریکیاں، خوبیاں، لطافت اور حسن درحقیقت ادب کا ہی حصہ ہیں اور ادب میں ہی ان کو بدرجۂ اتم برتا جاتا ہے۔ کثیر لسانی دنیا میں ہر زبان کسی نہ کسی خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے، کسی خاص مقام پر اس کی خصوصی نشو نما ہوتی ہے (گو کہ بعد میں اشاعتی و دیگر عوامل کے پس پردہ زبان کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان پر واضح علاقائی اثر ہوتا ہے زبان اسی خاص علاقے کی تہذیب، ثقافت، تمدن، رہن سہن، مذہب، عقائد، نظریات اور فطرت میں رچی بسی ہوتی ہے۔ اسی سے زبان کی شناخت بھی بنتی ہے اور زبان کے اجزا بھی تشکیل پاتے ہیں۔ زبان کو بلند ادبی معیار عطا کرنے والے عناصر: استعارے، تشبیہات، تلمیحات، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال،

مخصوص اشارے و کنائے ان سب کی جڑیں زبان کی اپنی تہذیب میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ اگر ان کو ذرا بھی الگ کرنے کی کوشش کی جائے تو زبان کی ممتاز وجداگانہ شناخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ترجمے میں ایک زبان دوسری زبان کے پیکر میں ڈھلتی ہے۔ ترجمہ کلی طور پر منتقلی کا عمل ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ جب بھی ایک زبان کے علائم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے گا تو اس میں تبدیلی واقع ہونا یا پہلی سی جامعیت وکاملیت باقی نہ رہنا ایک فطری ولازمی امر ہے۔ لہذا ترجمے کے بعد ہدفی زبان میں تیار شدہ متن میں اصل زبان کا ساحسن اور ویسی خوبی باقی نہیں رہ سکتی ، ادبی چاشنی، اسلوبی تنوع، زبان کی لفظی، معنوی و صنعتی نیرنگیاں باقی نہیں رہیں گی ؛ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کو منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صفت و علائم اور اسلوب وطرز ادا کی انفرادیت و جاذبیت کسی بھی صورت میں منتقل نہیں کی جا سکتی ہے تو پھر ترجمہ شدہ متن ادبی وشعری اوصاف سے یکسر خالی ہوگا، ایسی صورت میں کیا اسے ادبی کہا جا سکتا ہے ؛ کیونکہ ان کا تعین تو مندرجہ بالا ادبی عناصر کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ فکر وخیال اور موضوع و غیرہ کی بنیاد پر۔

ان دونوں گروپوں کی آرا اور دلائل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادبی ترجمے کے امکان وعدم امکان کے متعلق کچھ بھی کہنے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم ترجمہ کس چیز کا کرتے ہیں ؛ لفظ کا یا معنی کا۔ جو شخص بھی ترجمے کے میدان وعمل سے واقفیت رکھتا ہوگا وہ یہی کہے گا کہ جب ہم ترجمے کا عمل انجام دیتے ہیں تو اس کے ذریعہ ہمارا مقصد مفہوم یعنی معنی کو منتقل کرنا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کو اور الفاظ کا ترجمہ تو دور کی بات ہے ہم الفاظ کی بہت زیادہ پابندی و پیروی بھی نہیں کرتے۔ یہ جواب بہت ہی خوبصورت اور مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن صرف علمی، سائنسی اور صحافتی تراجم کی حد تک ہی اس کی خوبصورتی برقرار رہ سکتی ہے۔ ادبی ترجمے میں نہ اس جواب سے کام چلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ جواب فٹ آ سکتا ہے ؛ کیونکہ ادب صرف خیالات یا اس سے اوپر اٹھ کر صرف جمالیات، احساسات و وجدان کا ہی نام نہیں ہے ؛ بلکہ زبان کی صنعتوں، نزاکتوں اور باریکیوں کا بھی نام ہے۔ ادب میں اہل زبان کے لیے جو چاشنی ولذت ہوتی ہے اس کی اہم وجہ الفاظ کا محل استعمال، ترتیب، غنائیت، آہنگ اور جملوں کی ترکیب ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مضائقہ نہیں ہوگا کہ ادب میں بہت حد تک لفظوں کی بازی گری ہوتی ہے۔

ادب خواہ نثر ہو یا نظم دونوں کا ترجمہ انتہائی دقت طلب کام ہے۔ ترجمے کی اس مشکل سے سابقہ زیادہ تر کلاسیکی ادب میں پڑتا ہے۔ نثری ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر مصنف کا اسلوب اس کے اپنے تخلیقی تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک زبان کے فن پارے کے اسلوب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا از حد دشوار ہے۔ ہر زبان کے ادب کا خاص مزاج ہوتا ہے، لہجوں اور بولیوں کا جداگانہ آہنگ ہوتا ہے، لکھنوی رنگ میں رچے بسے ناول 'امراؤ جان ادا' کا ترجمہ اس لطیف ونزاکت آمیز

ماحول سے نابلد زبان میں کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے، رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' کے مسجع و مقفی اسلوب کو عربی و فارسی میں تو منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن کیا انگریزی و دیگر زبانوں میں اس کا نعم البدل مل سکتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی مکمل ہندوستانی دیہی فضا، ان کے کرداروں کا ٹھیٹھ دیہی عوامی لہجہ مغربی زبانوں میں کہاں تک منتقل کیا جاسکتا ہے؟

جب نثری ادب کا ترجمہ مشکل ہے تو شعری ادب کے ترجمے کی مشکلات کا ازخود اندازہ کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ یہ ادب کی سب سے اعلیٰ قسم ہوتی ہے۔ اشعار کی اہم خوبی یہی ہے کہ اس میں معنوی تہہ داری ہو، وہی شعر زیادہ اچھا مانا جاتا ہے جس میں کئی معنی پوشیدہ ہوں اور مختلف لوگوں کے لیے اس میں معنوی لذت موجود ہو۔ غالب کو ہم اسی لئے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار کا معنوی افق بہت وسیع ہوتا ہے، اس میں نیرنگی، جدت اور تنوع ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس میں سے معنی اخذ کر لیتا ہے۔ جب بھی کوئی مترجم اس کا ترجمہ کرے گا تو وہ اس کی موجودہ تشریحات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا یا کوئی نیا معنی پیدا کرے گا دونوں صورتوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس شعر کی معنوی تہہ داری ختم ہوجائے گی اور اس طرح شعر کا معنوی افق سمٹ جائے گا۔ شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دانستہ ابہام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ترجمے میں اس ابہام کو برقرار رکھنا کس حد تک ممکن ہے؟

کسی بھی زبان کے الفاظ اس کے تہذیبی خمیر سے تیار ہوتے ہیں۔ اہل زبان کے مزاج، آب وہوا، سماجی و معاشی پس منظر، سیاسی صورت حال اور مذہبی وابستگی ہر ایک کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ جیسے ہندی زبان کا لفظ 'کلش' سراسر ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا عکاس ہے۔ اس کے ساتھ جو تہذیبی لگاؤ یا مذہبی عقیدت وابستہ ہے کسی دوسری تہذیب یا زبان کے فرد کے لیے اس کو پوری طرح سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں کا حال یہی ہے کہ اس میں لفظوں کا جو کھیل ہوتا ہے اسے اہل زبان ہی کما حقہ سمجھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایسے افراد جن کی مادری زبان وہ نہ ہو، انہوں نے بعد میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اس کو سیکھا ہو، خواہ ان کو اس پر کتنا ہی عبور ہوجائے ان کے اندر زبان کا وہ ذوق یا ٹیسٹ نہیں پیدا ہو پائے گا جو اہل زبان کے اندر ہوتا ہے۔ مثال کے طور محبت، الفت، پیار اور عشق تقریباً ہم معنی لفظ ہیں۔ ڈکشنری میں اگر دیکھا جائے تو تقریباً یکساں معنی ہی ملیں گے۔ لیکن اہل زبان اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ کس مقام پر کون سا لفظ استعمال کرنا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی ماں سے عشق ہے؛ حالانکہ اس میں معنوی اعتبار سے زیادہ شدت ہے۔ لفظوں کا محل استعمال اور ان کی معنوی قوت سے اہل زبان ہی واقف ہوتے ہیں جیسے کسی معمولی پڑھے لکھے شخص کے بارے میں یہ کہا جائے کہ آپ افلاطونِ وقت ہیں، تو بجائے تعریف کے ذم شمار کیا جائے گا۔

اسی طرح بعض ادبی شہ پارے اہل زبان کی نظر

میں تو قابل مسرت و قابل لطف ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے وہ انتہائی بے معنی اور بے وقعت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس میں نہ کوئی معنویت ہوتی ہے نہ کوئی لذت۔ جیسے امرءالقیس کے معلقہ کا شعر ہے:

تری بعر الآرام فی عرصاتہ

و کیعانھا کانہ حب فلفل

(اس کے صحن اور آنگن میں اونٹ کی مینگنیاں ایسے نظر آتی ہیں گویا کہ کالی مرچ کے دانے ہوں)

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی خاص معنویت نظر نہیں آتی لیکن اس کے باوجود یہ شعر نہ صرف اپنے عہد میں پر لطف تھا بلکہ آج بھی عربی زبان وادب کا طالب علم اس کو بڑھتا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

غالبؔ کا مشہور مصرعہ ہے ''چلمن ہو یا نقاب سرکتی ضرور ہے''۔ اہل اردو اس مصرعے پر جھومتے ہیں ان کو اس سے خاص غنائی سرور ملتا ہے، ایک خاص منظر کی فلم ان کے ذہن میں کھنچ جاتی ہے۔ اس میں استعمال الفاظ 'چلمن' اور 'نقاب' کا مخصوص ثقافتی پس منظر ہے، پھر لفظ سرکنا سے خاص معنویت پیدا کی گئی ہے۔ اب اگر اس مصرعے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا انگریزی ادب یا تہذیب میں 'چلمن' اور 'نقاب' کا وہی تصور ہے جو مشرقی تہذیب میں ہے، دوسری بات یہ کہ انگریز قارئین کے ذہنوں میں یہ احساس پیدا ہوسکتا ہے کہ اس عام سی بات کو شعر میں کہنے کی کیا ضرورت ہے، کپڑا ہے تو سرک ہی سکتا ہے۔ داغؔ کا یہ شعر:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

ظاہر ہے کہ ترجمے میں یہ لطیف نکتہ منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ مومنؔ کی غزل کا یہ مقطع ملاحظہ ہو:

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

اس شعر کا مفہوم تو دوسری زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن مومن، بت خانہ، پارسا اور گمرہی کے درمیان صفت تضاد کو برت کر جو لطف پیدا کیا گیا ہے اس سے صرف اہل زبان ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسری زبان میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جو ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کریں اور امتیازی تہذیبی شناخت کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفرؔ کا شعر ہے۔

رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا

صبح کو خوف شب تار نے سونے نہ دیا

اس شعر میں کوئی گہری معنویت تو نہیں ہے' البتہ مخصوص صنعت کا التزام کیا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں موجود لفظ 'رات' کی مناسبت سے مصرع ثانی میں اس کے بالکل برعکس حروف والے لفظ 'تار' کا استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا ترجمہ کیا جائے گا تو اس کے مفہوم کو تو منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن اس لفظی صنعت کو کیسے اور کہاں تک برتا جاسکتا ہے؟ جب کہ شعر کی اصل جان یہی ہے۔ میر تقی میر کا شعر ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سوداؔ نے اس شعر کو سننے کے بعد اسے میرؔ کی والدہ کا شعر قرار دیا تھا۔ان کے بقول ایسا لگتا ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کو بڑی مشقتوں سے سلانے میں کامیاب ہونے کے بعد وہاں موجود افراد سے خاموش رہنے کی درخواست کر رہی ہو؛لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔شعر میں بڑی لطیف نزاکت پوشیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ میرؔ کے چند مشہور اشعار میں شامل ہے۔شعر کے ترجمے سے کیا مقصد حاصل ہوگا نیز یہ کہ دوسری زبان میں میرؔ کی یہ آہ کس حد تک سلامت رہے گی۔

اس نہج پر غور کیا جائے یا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ادب عالیہ بالخصوص شاعری کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔جیسے جیسے کلاسکیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ترجمے کی راہ میں دشواری بڑھتی جاتی ہے۔مفہوم کی منتقلی تک تو معاملہ ٹھیک ہے لیکن متن کی صفات وشعریات کی منتقلی نہ صرف دشوار بلکہ کسی حد تک ناممکن ہے۔اس سلسلے میں مترجم ہی عاجز نہیں ہوتا ، زبان بھی مجبور ہوجاتی ہے۔ جو تراجم ہمارے یہاں معروف مانے وسمجھے جاتے ہیں اور ادب عالیہ کا حصہ ہیں ان میں اولاً تو اکثریت نثری تراجم کی ہے،شعری ادب کے معروف ومقبول منظوم تراجم کی مثالیں بہت خال ہی نظر آتی ہیں، دوسرے یہ کہ ان تراجم کو معیاری قرار دیے جانے کے معیارات مجہول ہیں نیز ترجمے پر تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ کس حد تک لیا گیا ہے یہ بھی محل نظر ہے۔

لیکن ان تمام تر خدشات کے درمیان یہ حقیقت بھی رواں دواں ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں ترجمے کی قدیم روایت نہ صرف زندہ ہے؛ بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ توانا تر ہوتی جارہی ہے ۔ یہ ترجمے اس لیے ضروری ہیں کیونکہ زبانیں خصوصاً غیر ترقی یافتہ وترقی پذیر زبانیں ترقی یافتہ زبانوں سے مختلف طرح کا اخذ واستفادہ کرتی ہیں جن میں ادب بھی شامل ہے اور یہ استفادہ ترجمہ کی بدولت ہی ممکن ہوتا ہے۔اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ترقی اور نشوونما میں ترجموں کا کافی اہم اور بنیادی کردار رہا ہے۔

لہذا یہ بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ ناممکن سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہوگا؛ ہاں ادب خصوصاً شاعری کا ترجمہ بہر حال تخلیق کی مانند جامع اور حسین نہیں ہوگا اس کی ادبی جہتوں اور خصوصیات میں ضرور کمی آئے گی، نہ اس میں ویسی گہری ومتنوع معنویت ہوگی جو اصل زبان کے قارئین کے لیے اس متن میں موجود ہے اور نہ ہی وہ اس سے ویسا حظ اٹھا سکتے ہیں جیسا اصل زبان کے قارئین اٹھا سکتے ہیں۔سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ ترجمہ ہدفی زبان کے قارئین کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اصل زبان کے قارئین کے لیے۔ان تمام نظریات واصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جس طرح اصل کے ہم پلہ ومماثل ترجمہ ممکن نہیں ہے اسی طرح ترجمے سے مفر بھی ممکن نہیں ہے۔اس لیے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ان دونوں انتہاؤں میں توازن قائم ہو اور راہ اعتدال اپنائی جائے۔ ادب کے ترجمے میں نہ تو اصل زبان کا مکمل حسن تلاش کیا جائے اور نہ ہی ایسا ہو کہ ترجمہ کو ہی ناممکن قرار دے دیا جائے۔

☆☆☆

سیما انجم
ریسرچ اسکالر
شعبۂ ترجمہ
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔۳۲

فنِ ترجمہ۔ضرورت اور اہمیت

۱۔۱ ترجمہ کی تعریف:

'' ترجمہ نام ہے ایک سعی مشکور کا جس کے صلہ میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے''

پروفیسر البرٹ گیراڈ (۱۹۴۰)

''ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے''

(ترجمہ کا فن'' ابتدائیہ نظری مباحث ، ۴۶ قبل مسیح تا ۱۹۸۶ از ڈاکٹر حامد بیگ، کتابی دنیا دہلی، سنہ اشاعت ۲۰۰۵ صفحہ ۱۵ اور ۶)

حضرت انسان کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ اپنے جذبات واحساسات، اپنے کارنامے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے ۔ اسکے لئے وہ مختلف ادوار میں مختلف انداز اپنایا گیا۔ایک دور تھا جب لوگ آوازوں، اشاروں، آنکھ، ہاتھ، پیر وغیرہ کا سہارا لے کر اس کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ روز اول ہی سے لسانی ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے۔اور انسان ترقی کے منازل طے کرتا چلا آرہا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح میں، کاغذ کی ایجاد سے قبل لوگ اشارات، علامات، سے یا چٹانوں یا درختوں پر مختلف اشکال کے ذریعہ اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچایا کرتے تھے۔یعنی کاغذ، قلم، اور روشنائی سے قبل خیالات کو لکیروں پینٹنگ، اور ڈرائنگ کے ذریعہ سمجھایا، جاتا تھا۔

ترجمہ علم کے پھیلاو کا واحد ذریعہ ہے چونکہ ماضی قریب تک بھی نئی تحقیق ، نئی ایجادات و مشاہدات محدود قطعوں تک ہی پائے جاتے تھے، علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ آمدورفت کے ذرائع و وسائل اور ٹیلی کمیونیکیشن کے ذرائع میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔نتیجہ میں علم کو دوسروں تک یعنی مختلف قطعوں تک پہنچانا ممکن ہوسکا۔

پروفیسر البرٹ گیراڈ (۱۹۴۰) کا متذکرہ بالا قول جس میں ترجمہ کو سعی مشکور قرار دیا گیا ہے، اور مشقت کے بعد حقارت ملنے والی بات کہی گئی ہے یہ بات آج کے تناظر میں بہت اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ آج ترقی کا دارومدار ترجمہ ہی پر منحصر ہے اور یہ سعی نا مشکور بھی نہیں رہا۔اس کی مثال دنیا کے تیز ترین سرچ انجن ''گوگل'' سے لیں تو چند ہی سکنڈس میں دنیا کے کسی بھی شئے کے مواد کو ہم مختلف انداز سے دیکھ سکتے ہیں کہیں PPT ، تو کہیں ویڈیوز ، اور کہیں تحریریں ۔ یہ ایسے ذرائع ہیں جن سے مختلف علوم کو ہم تفصیلی طور پر دیکھ سکتے ہیں یقیناً یہ ترجمہ ہی کمال ہے کہ آج ہر ترقی

یافتہ زبان میں ہر چیز کا مواد دستیاب ہے۔ چند سالوں قبل بھی اردو اس میدان میں نہیں تھی لیکن آج ہمیں صد فیصد نہیں تو پچاس فی صد کامیابی ہمیں ضرور نظر آنے لگی ہے، امید ہے کہ وقت کے ساتھ اردو بھی معلومات کی ترسیل کا ایک مکمل اور مستند ذریعہ بنے گی۔

اسی طرح ترجمہ نگاری دنیا کی ایک ابھرتی صنعت کا روپ لے رہی ہے جس کے لئے انفرادی، اجتماعی عملی اور کمپیوٹر ایڈڈ (Computer aided) ترجمے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

احمد فخری حاجی ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک ترجمہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی مادری زبان کا لباس پہنایا جائے۔ ان کو اپنے الفاظ اور محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمہ اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو''۔

احمد فخری مضمون و تراجم' مطبوعہ رسالہ اردو' اکتوبر ۱۹۲۹ مشمولہ ترجمہ کا فن، مرزا حامد بیگ صفحہ نمبر ۶۲ سنہ اشاعت ۲۰۰۵

واضح ہو کہ یہ مضمون ۱۹۲۹ میں لکھا گیا تھا یہ دور خالص ادبی دور تھا جس میں تراجم کے لئے محاورات اشارات و کتابیات کو جاننا ضروری تھا۔ ادب کا ترجمہ کوئی آسان نہیں تھا، چوں کہ ہر تہذیب کی اپنی زبان ہوتی ہے اور ہر زبان کے اپنے محاورے جو مختلف مواقعوں پر بولے جاتے ہیں، اس کے لئے مترجم کو مکمل طور پر اس زبان کی تہذیب و ثقافت سے مکمل طور پر واقف ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ مطلب کو سمجھانے میں مشکل پیش آسکتی ہے، چونکہ محاورات میں اصل کے لطف کو برقرار رکھنا کمال ہے مثال کے طور پر مندرجہ بالا محاورات سے اس کو سمجھیں گے:

۱۔ سوسُنار کی ایک لوہار کی

۲۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں

۳۔ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی

ان کو سمجھنے سے قبل یہ واضح ہو جائے کہ ترجمے دو مقاصد کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ایک علم کے پھیلاؤ کے لئے اور دوسرا زبانوں کو سیکھنے کے لئے۔ اب وہ شخص جو زبان کو سیکھ رہا ہے' لفظ سُنار اور لوہار سے واقف ہوسکتا ہے یا لغت میں ان الفاظ کے معنی دیکھ کر ان کے مفہوم سے واقف ہوسکتا ہے۔ لیکن اس جملہ کے تہذیبی سیاق کو سمجھے بغیر وہ نہ تو اس محاورہ کو سمجھ سکے گا نہ ہی اس کو ترجمہ کے ذریعہ دوسری زبان میں منتقل کر سکے گا۔ محاورتی زبان کا ترجمہ بھی محاوراتی ہی ہوگا کیونکہ اس طرح کی زباں عام طور پر ادبی زبان کی ہی ایک صورت ہوتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات اور دیگر ادبی و شعری عناصر مثلاً صنعت وغیرہ بھی اس زمرہ میں آتے ہیں۔ محاورات بہت دلچسپ ہوتے ہیں جس کی پہلی شرط اس کو سمجھنا ہے اور ترجمہ کے ذریعہ اسے سمجھا دیا جائے تو یقیناً یہ ذہانت والا کام ہے۔ محاوراتی یعنی شعر و شاعری کے ترجمہ کے بعد یہ دیکھتے چلیں کہ علوم کو پھیلانے میں ترجمہ کس طرح معاون ہے۔

بقول شہباز حسین کے:

'' ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمہ نے تخلیق کا درجہ پالیا ہے''۔

ترجمہ کی اہمیت، شہباز حسین' مشتمولہ ترجمہ کا فن اور روایت ، ڈاکٹر قمر رئیس، صفحہ نمبر ۱۸۱ سنہ اشاعت ۲۰۰۴

اس ترجمہ کی کنجی کا آج یہ حال ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں ترجمہ کے بغیر بیکار ہیں اور جب تک ترجمہ نہ ہوگا زندگی میں آسانیاں پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ہر ترقی یافتہ زبان میں نئی ایجادات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی بھی صلاحیت آچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر زبان میں ہر قسم کی معلومات باسانی حاصل ہورہی ہیں۔ ساری دنیا میں علمی بصیرت کا معیار حد درجہ بڑھ چکا ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے ہم ترجمہ کے تعلق سے ڈاکٹر سلیم اختر کے نظریات پر روشنی ڈالیں گے:

'' ترجمہ شعار روشنی ہے زبان جن علوم سے آشنا اور جن فنون کے رموز سے ناواقف ہوتی ہے، تراجم سے یہ کمی پوری کی جاتی ہے۔ کسی زبان کی بلند پایہ رجحان ساز اور آفاقی اہمیت کی تخلیقات کو اپنی زبان میں اس لئے منتقل کیا جاتا ہے کہ مانگے یا مانگنے کا اجالا ہے' مطلب اس کی اہمیت کو کم کرنا اور اس کی ضرورت سے انکار کرنا نہیں بلکہ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی ضروری اور اہم کیوں نہ ہو اصل زبان کے مقابلہ ترجمہ کی گئی زبان میں وہ مانگے کا اجالا ہی رہے گا''

سلیم اختر، اُردو زبان کی مختصر تاریخ' صفحہ نمبر ۱۹۱ سنہ اشاعت ۲۰۰۸

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق ترجمہ، مانگے کا اُجالا ضرور ہے لیکن یہ روشنی، آج دنیا کے کونے کونے میں پھیل کر اسے جہالت کے اندھیرے سے نکال کر شعور کی آگاہی تک پہنچا رہی ہے جہاں اس کا صحیح استعمال ہورہا ہے وہاں پر اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ بات چاہے مذہبی تراجم کی ہو یا علمی تراجم کی ہر دو صورتوں میں ترجمہ ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ الہامی کتب کے تراجم سے ایک اللہ یعنی وحدانیت کا اقرار ہورہا ہے وہیں علمی تراجم سے دنیاوی فائدے اٹھائے جارہے ہیں۔ ان میں روزمرہ زندگی کی آسانیاں تو میسر ہو ہی رہی ہیں اس سے پرے، انسان ،رب کائنات کے بخشے ہوئے دماغ کا استعمال کرکے خلاوں کو مسخر کررہا ہے۔ ترجمہ ہی ان سب چیزوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

ترجمہ روز اول ہی سے تہذیبی وعلمی ضرورت رہا ہے۔ مختلف ذرائع سے یہ آگے بڑھتا رہا اور اب ترقی کی رفتار میں اس حد تک اضافہ ہوگیا کہ اس نے دنیا کو'' گلوبل ویلیج ''میں تبدیل کردیا۔

ماحاصل کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ ترجمہ ہر وقت اور ہر دور کی ایک پہچان رہا ہے

۲۔ ترجمہ ہر نئی ایجاد کی کامیابی کا ضامن ہے۔

۳۔ ترجمہ مختلف تہذیبوں کو مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۴۔ ترجمہ معلومات کی اکائی ہے۔

۵۔ ترجمہ ایسا عمل ہے جس سے خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔

۶۔ یہ ترجمہ ہی ہے جس سے نئی ایجادات، نئی دریافتیں، کی

آگاہی محدود سے لامحدود قطعوں میں پہنچ رہی ہیں۔

۲۔۲ ترجمہ کے اقسام

بدلتی ضرورتوں کے ساتھ دنیا بھر میں سینکڑوں اقسام کے تراجم کئے جارہے ہیں، بنیادی طور پر ان کی تین اقسام ہوتی ہیں۔ اسکی تشریح ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس طرح کرتے ہیں:

''عام طور پر دنیا بھر میں ترجمہ چار وجوہات کی بنا ء پر ہوا ہے''۔ آگے وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک ترجمہ کی مختلف اقسام کا تعلق ہے ان میں حسب ذیل بنیادی حیثیت کی ہیں:

۱۔ علمی ترجمہ

۲۔ ادبی ترجمہ

۳۔ صحافتی ترجمہ

ان تراجم کی تشریح مزید وہ اس طرح کرتے ہیں:

علمی ترجمہ:

اس ذیل میں تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں:

علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمہ کی ذیل میں آتا ہے اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جس کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جاتا ہے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمہ میں یکسانیت برقرار رہے۔

ادبی ترجمہ:

اس نوع کے ترجمہ کے لئے ضروری ہے کہ با محاورہ کیا جائے۔ اپنی زبان کی روز مرہ تشبیہات، ضرب الامثال استعارات وکتابیات اور رموز وعلامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمہ میں ادبی رنگ آجائے اور ترجمہ طبع زاد دکھائی نہ دے۔

صحافتی ترجمہ:

اسے کھلا ترجمہ بھی کہا جاتا ہے اس نوع کا ترجمہ مفہوم کے ترجمہ کی ذیل میں آتا ہے''۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ترجمہ کی ضرورت، مشتملہ فن ترجمہ نگاری' مرتبہ خلیق انجم' صفحہ نمبر ۲۳ تا ۲۵' سنہ اشاعت ۱۹۹۶

اس حوالہ کی رو سے علمی ترجمے میں تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں اور مترجم کا بنیادی مقصد بھی یہی ہوتا کہ نئی زبان معلومات کی ترسیل دوسری زبان میں اسطرح ادا کرے کہ وہ اصل سے قریب تر نظر آئے تاکہ ترجمہ کا مقصد پورا ہو جائے۔ سائینسی تراجم کی یہی ایک خاصیت ہے کہ اسے واضح طور پر کھول کھول کر بیان کیا جائے چونکہ سائینسی علوم ماضی کے تجربات کے ساتھ حال اور مستقل سے جڑتی ہیں۔ ان سے بھرپور طریقہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کے ہر پہلو پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ ترجمہ اصل سے قریب ہو سکے۔

دوسری قسم ادبی ترجمہ کی ہے جس میں کسی تہذیب وثقافت کی نمایندگی کی جاتی ہے۔ اس ترجمہ میں صرف مختلف تصورات کی ترسیل ہی نہیں ہوتی بلکہ اس جگہ کے لوگوں کے رہن سہن، ان کا معیار زندگی، وہاں کی ترقی کی مکمل معلومات، ہم تک پہنچتے ہیں یعنی ادبی ترجمہ دراصل عالمی سطح پر افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے جس میں مختلف اقوام کے احساسات،

جذبات،اعتقادات علوم و فنون کی کامیابیوں سے ہمیں روشناس کرواتا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام عالمی تہذیبیں آپس میں اپنے اپنے ادبی و علمی سرمایہ کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی رہیں اور اپنی زبانوں میں اسے محفوظ کرتی رہیں۔

حوالہ کی رو سے تیسری قسم صحافتی ترجمہ ہے۔اسے آزاد ترجمہ بھی کہتے ہیں۔ چونکہ اس میں لفظ بہ لفظ ترجمہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجموعی طور پر مفہوم کو سمجھ کر ترجمہ کیا جاتا ہے یعنی اخبارات کا مطالعہ معمولی پڑھا لکھا شخص بھی کرتا ہے اور بڑا افسر بھی ،جھونپڑی میں رہنے والا بھی کرتا ہے،کوٹھیوں میں رہنے والا بھی۔ ان سب کے سامنے ایک ہی مطلب و مفہوم کو پیش کرنا پڑتا ہے۔اور اس کے لئے آسان و عام فہم زبان میں خیالات کی ترسیل کرنی پڑتی ہے۔

ترجمہ کے بارے میں مولانا عبدلماجد سالک لکھتے ہیں:

''اخباری ترجمہ میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔اس کے لئے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے ،اگر اخباری مترجم سادگی سلاست اور اور محاورہ۔اُردو کو مدنظر رکھ کر کریں تو خود بھی آرام سے رہیں گے اور پڑھنے والوں کا ذہن بھی نہ الجھیں گے ، ان کو چاہئے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک بار پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ ورنہ ادھر ادھر کی کمی بیشی کر کے اسے پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار رہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی دان اور بڑے اُردو دان ہیں۔کیونکہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آجائے جو فقرے میں جان ڈالدے۔

فن ترجمہ نگاری، پروفیسر ظہیر الدین، سنہ اشاعت ۲۰۰۶ صفحہ نمبر ۶۶۔

اس کی تقسیم کے بارے میں آگے وہ لکھتے ہیں:

''دنیائے ادب میں اب تک ترجمہ کا جتنا بھی کام ہوا ہے ہم اسے مجموعی طور پر دو بڑے زمروں میں رکھ سکتے ہیں:

۱) موضوعاتی

۲) ہیئتی یا فنّی''

دور جدید کو ہم Specialization کا دور کہیں گے چونکہ جتنے علوم و مضامیں دنیا میں وجود میں آرہے ہیں ان کی بے شمار ذیلی شاخیں بھی وجود میں آچکی ہیں۔اس لئے اب کسی ایک شاخ سے ہی اختصاص ممکن نہیں ۔ ان شاخوں کا مختصر جائزہ لیں تو ان کی سینکڑوں ذیلی شاخیں ہمیں آسانی سے مل جائیں گی۔ مثلاً پچھلے ساٹھ ستر سالوں قبل علم طب کی دو یا تین شاخیں ہی تھیں ان میں ایورویدک اور یونانے قابل ذکر ہیں ج کدور کے ایلوپیتھی طریقہ علاج سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ان میں آنکھ ناک ،کان ، دل ،

گردے، جگر، گویا ہر عضو کا ایک دائیرہ مطالعہ اور ایک ماہر ڈاکٹر ہے ۔ میڈیکل کی جن شاخوں کو ہم Opthalmology, Gynocology, Nephrology, Cardiology, Dermetology Neorology, E N T Specialistوغیرہ کے نام سے جانتے ہیں ان تمام کے کتب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح انجنیئر نگ شعبہ بھی اس کی ایک مثال ہے ۔ جیسے کمپیوٹر، الکٹریکل، سیول پٹرولیم، آئی ٹی، وغیرہ مختلف مضامین ہیں ایک اندازہ کے مطابق ہندستان میں اس علم کی تقریباً ۷۰ ذیلی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

اسی طرح سماجی، مذہبی، عمرانی، اقتصادی، سیاسی، ادبی موضوعات کی بھی کئی کئی ذیلی شاخیں ہیں' ان سب کے الگ الگ ماہریں بھی ہوتے ہیں ۔ادب میں بھی افسانے کا ماہر کوئی تسلیم کیا جاتا ہے اور شاعری کا کوئی اور مذہبی علوم میں اسلام کے حوالے سے مفسر، محدث، فقہ وغیرہ کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو ہر مرض کا صرف ایک ہی ڈاکٹر ہوا کرتا تھا ایک حکیم بھی ساری بیماریوں کا علاج کرلیا کتے تھے ۔ اسی طرح ایک انجینیر سبھی کاموں کو بخوبی انجام دیتا ۔ اسی طرح ایم ۔ اے پاس شخص جس مضمون میں ایم ۔اے ہوتا' اس کی تمام شاخوں پر دسترس رکھتا تھا۔

بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی بڑھتی جارہی ہیں جس کا سلسلہ جاری ہے ۔ حدتو یہ ہے کہ تمام مضامین کا تفصیلی جائیزہ لیں تو ایک ضخیم رسالہ صرف اور صرف مضامین کے نام کا بآسانی بن جائے گا ۔اُردو میں ترجمہ کے اولین دور کے نظریہ ساز ناقد حاجی احمد فخری کے الفاظ اس طرح ہیں:

''یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور اپنے علمی خزانے کو معمور کرتی ہے''۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، نظری مباحث ۴۶ قبل مسیح سنہ اشاعت ۲۰۰۵ صفحہ نمبر ۷۔

یوں تو علم کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہی ہوتی ہے جب اللہ رب العزت نے اپ کو دنیا کے علوم سے سرفراز کیا۔ یہی علم اپنی منازل طے کرتا ہوا آج اس مقام تک آ پہنچا، اسی علم کا سہارا لے کر حضرت انسان آج خلاوں کو مسخر کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

ماضی قریب میں علم کی ترویج و اشاعت میں عباسی خلفاء کا اہم کردار رہا ہے ۔ان میں سب سے نمایاں کردار مامون الرشید کا ہے جنہوں نے دنیا کے سارے علوم کو عربی زبان میں منتقل کروالیا۔ اس کے لئے انہوں عراق کے شہر بغداد میں ۸۳۰ھ کو ایک رصدگاہ تعمیر کروایا جس کا نام ''بیت الحکمہ'' رکھا۔ وہاں مختلف علوم کے تراجم کروانے کے لئے انہوں نے دنیا بھر سے ماہر اور قابل سائنسدانوں کو جمع کیا اور تمام علوم کو عربی میں منتقل کروالیا ۔علم ہندسہ، علم ہئیت، جیومٹری، الجبراء اُسی دور کی ایجادیں ہیں ۔ الجبراء کا موجد

''محمد ابن موسیٰ ال خوارزمی'' کو مانا جاتا ہے۔لیکن اس سے قبل آرشمیدس اور Euclid نے بھی اس پر کافی کام کیا۔ انہوں نے نہ صرف زمین کے طول وعرض کی پیمائش کی بلکہ چیزوں کی جسامت مثلث وغیرہ جیسی جیومٹری پر بھی دنیا کی توجہ مبذول کروائی۔

A D ۹۸۰ میں پیدا ہونے والے ماہر طب ابن علی الحسین ابی سینا (جنہیں یورپ میں Avicena کے نام سے جانا جاتا ہے)۔ یہ زمانہ کے مشہور ماہر طب تھے' ان کی کتاب ''کتب القانون الطب'' دنیا کے مختلف کونوں میں مشہور ہوئی۔ان کے مایہ ناز کارناموں کی بناء انہیں ''طب کا موجد'' کہا جاتا ہے۔

قدیم تہذیب سے پتہ چلتا ہے کہ علم طب ،علم ہئیت اور فلسفہ کو اس دور میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔اسی دور کے قابل ذکر ماہر فلکیات محمد ابن جابر ابن نسان الباطنی ہیں۔اس دور میں علم کی یہ ترقی اپنے دامن مین ترجمہ کی شاندار روایت بھی رکھتی ہے۔یہ ترجمہ ہی تھا جس نے علوم کے دروازے ان اقوام پر بھی کھول دئے تھے جو ابھی ترقی کے دور میں کافی پیچھے تھیں۔

پروفیسر محمد حسن کے بقول، مقاصد کے لحاظ سے ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

'' بنیادی طور پر کسی ترجمہ کے تین مقاصد ممکن ہیں' پہلا معلوماتی ، دوسرا تہذیبی ، تیسرا جمالیاتی الفاظ مختلف قسم کے انداز کی ترسیل کرتے ہیں پھر ترسیل کی مختلف سطحیں ہیں۔سب سے اوپری اور کسی قدر آسان سطح معلوماتی ہے۔ مترجم کا بنیادی مقصد نئی زبان کی وساطت سے معلومات کی ترسیل ہے۔ یہاں ترجمہ جتنا اصل کے قریب ہوگا معلومات کی ترسیل کا حق اتنا ہی بہتر طور پر ادا ہو سکے گا ، اس ضمن میں سائنسی علوم کے ترجمے آئیں گے یہاں ترجمہ کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ کتنے شفاف طور پر اصل کی معلومات ترجمہ کے ذریعہ دوسری لسانی برادری کے سامنے آئیں، سب سے اہم مسئلہ اصطلاحات علمیہ کا ہے۔جن کا ترجمہ اول تو ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو کچھ اور مفہوم ادا کرنے لگتا ہے ''

ترجمہ، نوعیت ، و مقصد ، پروفیسر محمد حسن صفحہ نمبر ۶۱ مشمولہ'' ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس، سنہ اشاعت ۲۰۰۴۔

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ترجمہ کے مقاصد واضح ہو جاتے ہیں اور انہیں مقاصد کے تحت ترجمہ کا طریقہ کار بھی از خود متعین ہو جاتا ہے۔اب اگر ترجمہ علمی ہے تو بنیادی متن کا ہر لفظ اہم ہے اور اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ اگر ادبی متن ہے تو پھر مترجم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کیفیت اور تاثر کو بھی مفہوم کے ساتھ ساتھ منتقل کرنے کی کوشش کرے جو اصل فن پارے میں پائی جاتی ہے اور اگر مقصد محض خبر دینا ہے ،تو پھر مفہوم کو اپنی زبان میں آزادانہ طور پر ادا کر دیا جانا چاہیے۔ ذیل میں ہم ترجمہ کے انہیں طریقوں پر گفتگو کریں گے۔

۲۔ ترجمہ کے طریقے:

دورِ جدید میں تراجم کے جو طریقے اپنائے جا رہے ہیں ان میں ایک تو لفظی ترجمہ ہے جس میں لفظ بہ لفظ

ترجمہ کردیا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر سائینسی مضامیں کے مشکل الفاظ ترجمہ ہوتا ہے۔ جسے کبھی متن کو سمجھ کر اپنے انداز میں قابل فہم بنایا جاتا ہے کبھی زبان کی نزاکتوں کو دیکھ کر ایسا طریقہ اپنایا جاتا جاتا ہے جس سے قاری بآسانی مفہوم کو سمجھ سکے۔

دور جدید کا ایک مقبول عام طریقہ پی، پی، ٹی ہے جس میں تصاویر کے ذریعہ معلومات کی ترسیل اپنی اپنی زبانوں میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم نئی ٹکنالوجی کے معلومات کے پھیلاؤ کی لیں گے۔ کسی نئے انکشاف، جیسے کسی نئی مشین کی معلومات ترسیل کرنی ہوتی ہے، اسے تصاویر کے ذریعہ ہی پی، پی، ٹی سے اپنی زبان میں مکمل تشریح فراہم کی جاتی ہے۔

ترجموں کے طریقوں کو جمیل جالبی اس طرح پیش کرتے ہیں:

'' ترجمہ کے تین طریقے ہو سکتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کردیا جائے اور بس (اسے ترجمہ کہنا نہیں کہتے مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں) دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبانوں کے روایتی و مقبول انداز بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کردیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے ایسے ترجموں سے زباں و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ بیان کا ایک نیا سانچہ آجاتا ہے، دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع کردیتی ہے۔''

جمیل جالبی ڈاکٹر، مضمون ترجمہ کے مسائل مشمولہ ،ترجمہ کا فن نظری مباحث ۴۶ قبل مسیح تا ۱۹۸۶' صفحہ نمبر ۸۷' مرتبہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ' سنہ اشاعت ۲۰۰۵۔

اس حوالہ میں جو طریقہ کار بتایا جارہا ہے وہ لفظی ،آزاد اور نفس مضمون کو دیکھ کر اپنی صلاحیتوں سے زبان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے متن کا ترجمہ کرنا ہے۔ سارے علوم کے تراجم کے لئے ان تینوں طریقوں کو اپنایا جاسکتا ہے یعنی مضمون کو پڑھ کر ترجمہ کا جو طریقہ مناسب لگے بلا جھجک اسے اختیار کر لیں۔ مختلف علوم سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کی سوچ بھی مختلف ہوگی۔ آج کا قاری وقت اور ضرورت کی اہمیت کو جانتے ہوئے اس مشینی دور میں صرف اپنے ہی مضمون میں دلچسپی لیتا ہے۔ وقت اسے اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے مضامین میں اپنا وقت ضائع کرے (ہاں! کسی مضمون سے اسکا گہرا لگاو ہے تو وہ اور بات ہے)۔ چونکہ ہر مضمون اپنے اندر ایک گہری وسعت رکھتا ہے جس کے سیکھنے کے لئے کافی محنت اور وقت درکار ہتا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہم کمپیوٹر کی لیں گے' ان کی درجنوں ذیلی شاخیں ہیں۔ اس کی ایک شاخ ہی کو سمجھنے کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں اور ابھی اس کے سمجھنے کے دوران اسی مضمون میں کئی نئی معلومات کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جیسے Programming, Net

working, Security,Biometric وغیرہ وغیرہ ایسی مثالیں ہیں جس میں ہر آئے دن نئی معلومات کا اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے اور ان تمام کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔

Charles Babbage نے جب ریاضی کی آسانی کے لئے چند مشینیں بنوائیں تب اس میں صرف جمع، تفریق کا کام ہوا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس مشین میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جس سے مزید ریاضی کے سوالات کو آسانی سے حل کیا جاسکے۔ یہ کمپیوٹر کی سب سے اولین مشین تھی۔

Konrad Zse نے ۱۹۴۱ میں اسی مشین میں کچھ ترمیمات کر کے Programable کمپیوٹر بنوایا۔ یعنی ایسا کمپیوٹر جس میں چند ایک پروگرام بھی کر سکے۔ یعنی یہ کمپیوٹر کی دوسری بدلی ہوئی شکل تھی۔

Alan turing جو ایک ریاضی دان ہے، نے اس کی بدلی ہوئی شکل یعنی Universal Machine (عالمی مشین) کا آئیڈیا دیا جس کی مدد سے مختلف مسائل کو حل کیا جانا ممکن ہو سکے۔ ترقی کے منازل طے کرتا ہوا کمپیوٹر جس منزل پر ہے اس سے ہم آج اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف ایک انگلی سے دنیا بھر کے معاملات طے پا رہے ہیں۔

ایک اور مثال ہم ماضی اور حال کے ذرائع آمدرفت کی لیں گے کہ کیسے گھوڑوں، گدھوں اور اونٹ سے لیا جانے والا کام سیکل رکشہ اور آٹو نے لیا۔ پھر زمانے نے ایک قدم اور بڑھایا تو کاریں بسیں اور ٹرک نظر آنے لگے اور پھر ہوائی جہاز نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح مہینوں کا کام دنوں میں، دنوں کا کام گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا کام منٹوں اور منٹوں کا کام سکنڈس میں ہونے لگا، ترقی کی اس رفتار میں جتنی مشینیں آتی گئیں ان سب کی تعلیم اور ان کو چلانے کا طریقہ معلوم کرنا ضروری تھا' ان سب کے لئے علوم کے مختلف شعبے بنتے گئے جیسے سمندری جہازوں کے لئے Navigation ہوائی جہاز کے لئے Aerospace اور زمینی ذرائع کے لئے Land Transport جیسے ڈپارٹمنٹ قائم ہونے لگے۔ اسی طرح فی زمانہ مترجم کے لئے سب سے اہم کام نفس مضمون کو سمجھنا ہے۔ اور جہاں Coding اور Formulae کو لکھنا ہو وہاں اسے جوں کا توں لینا ضروری ہے ورنہ کسی اونچ نیچ میں ترجمہ بے فیض ہوگا۔

مختلف مضامین کے لئے ترجمہ کے مختلف طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ کسی مضمون میں معمولی سے ترجمہ سے سیاق کو سمجھا جا سکتا ہے' کسی میں بغیر P P T کے مطلب کو سمجھنا ممکن نہیں۔

اسی طرح دو طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ ایک وکی پیڈیا کی شکل کے ذرائع جس میں نثری تراجم کو اسانی سے پڑھا جا رہا ہے اور دوسرا طریقہ Audio اور Video کا ہے جس سے مضامین کی اچھی طرح سے تشریح کی جا رہی ہے۔

☆☆☆

تبریز حسین تاج
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔۳۲، تلنگانہ

ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھانے میں مولانا آزاد کا کلیدی رول

ہندوستان میں آج جو خود مختیارانہ اعلیٰ تعلیم کا نظام ہے۔ یہ مولانا آزاد کی دوراندیشی اور صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ کیونکہ آزاد نے ملک کی آزادی کے بعد پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہندوستانی قوم کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مشل اور مشعل راہ ثابت ہونگے۔ایک سچے مسلمان ہوتے ہوئے آزاد نے ہندوستانی سماج کی طبیعت وکیفیت کے مطابق جو تعلیم کا نظام پیش کیا ہے وہ ملک کی ترقی میں ایک جانب بہترین راستہ فراہم کررہا ہے۔ان کی بنائی تعلیمی پالیسیوں کی وجہ سے ملک شب وروز جدید فنی ترقی کے منازل طئے کررہا تو وہیں دوسری جانب آزاد کی آزادانہ سوچ وفکر نے ملک کی ثقافت، تہذیب وتمدن کی بقاء کا کام بھی بہ خوبی انجام دیا ہے۔ کیونکہ جمہوری ہندوستان میں یکساں تہذیب کا عکس نہیں جھلکتا ہے بلکہ ہندوستان کی صدیوں قدیم تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔جو ہمیشہ آزاد کے حب الوطنی کا ثبوت پیش کرے گی۔چونکہ کثرت میں وحدت اس ملک کا اٹوٹ اثاثہ ہے۔آزاد نے اس اثاثے کو برقرار رکھنے کیلئے انتھک کوشش کی جس کی مثال للت کلا اکاڈمی اور ساہتیہ اکاڈمی اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن کا قیام کرنا ہے۔

اگر مولانا آزاد کے شب وروز پر نظر ڈالیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ موسیقی مولانا آزاد کو بے حد پسند تھی۔خود مولانا آزاد کو موسیقی کے فن سے خاصی جانکاری بھی تھی۔مولانا آزاد موسیقی کو زندگی کا سہارا اور جسم ودل کی تمام تر بیماریوں کا علاج مانتے تھے۔مولانا موسیقی سنے بغیر نہیں رہ سکتے تھے بلکہ اِن کی خوشی بھی اسی میں مضمر تھی۔اس کا ذکر اُنہوں نے غبار خاطر میں یوں کیا ہے کہ:

''میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا''

اگر صنف ناز اور مولانا آزاد کی بات کریں تو اس معاملے میں مولانا آزاد ہر شرعی پابندیوں سے پوری طرح آزاد دِکھائی دیتے ہیں۔موسیقی کی وجہ سے ہی وہ مصری گلوکارہ طاہرہ سے شناسائی بنا پائے تھے جس کا ذکر بھی غبار خاطر میں موجود ہے۔

''وہ خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اس بھی زیادہ آفتِ ہوش وایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات دیکھے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی''

مولانا آزاد عربی گلوکارہ اُم کلثوم کے بھی بڑے شدائی تھے ۔ مولانا باقاعدہ طور پر اُم کلثوم کی آواز کے ریکارڈ محفوظ رکھتے تھے اور اُس محظوظ ہوتے تھے:

''میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سنے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شخص نے اُم کلثوم کی آواز نہیں سنی وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کرسکتا''

مولانا آزاد موسیقی کو شریعت کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ مفتیان کرام نے اس معاملے میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ انتہاء پسندانہ رویہ ہے۔ بلکہ اسلام حقیقت میں فنون لطیفہ کے خلاف نہیں ہے۔

''اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ فقیہہ نے اس معاملے میں تشدد کیا''۔

مولانا نے اپنے ہفتہ روزہ 'الہلال' میں بھی اس تعلق سے یوں تحریر کیا ہے کہ:

''میں یہ کہنے میں نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں' اس لیے اس شئے سے قطع تعلق نہیں کرسکتا جس کا تعلق دل کے ساتھ جسم وروح کا تعلق ہے''۔

مولانا آزاد کے اِن تمام نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ موسیقی کو چاہتے تھے کیونکہ موسیقی ہندوستانی تہذیب کی روح مانی جاتی ہے۔موسیقی کے تئیں آزاد کی چاہت اس بات کا واضح پیام دیتی ہے کہ وہ ہندوستانی فنون لطیفہ کے بے انتہاء عاشق تھے۔یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے ملک کی آزاد کی بعد جب وزارت ثقافت کی قلمدان سنبھالا تو اس کو فروغ دینے کے ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔جس کا آگے ذکر کیا گیا ہے۔

اگر ہم یہاں اسلامی نقطہ نظر سے موسیقی (سماع) کی بات کریں تو بعض عالم دین اور مشائخ نے اس کے موافق میں لکھا ہے تو بعض اس کے ممانعت میں لکھا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔لیکن جن لوگوں نے اِسے صحیح ٹھہرایا ہے' اُن ہی میں معروف اسلامک اسکالر و خانقاہ منعمیہ میتن گھاٹ پٹنہ سٹی کے سجادہ نشین سید شمیم الدین منعمی ہیں۔جنہوں نے ڈاکٹر التفات امجد کے مرتب کردہ 'روح سماع منتخب عربی و فارسی) جلد اول کے بارے میں کیے گئے ایک تبصرے میں اُنہوں نے یوں تحریر فرمایا ہے کہ'' حسن صورت اچھی آواز خوش گلوئی بھی معجزات انبیاء میں سے ایک ہے اور یہ رغبت، انابت اور رقّت کا سب سے معتبر ذریعہ ہے۔خوش الحانی کے نتیجے میں جہاں ایک طرف ہمہ تن گوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہیں دوسری طرف روح کو سیرابی اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔روتا بچہ سوجاتا ہے اور غافل راغب ہوجاتا ہے۔خوش گلوئی میں اگر سنگت اور جگت بھی مل جائے تو کیا کہنے یعنی اکیلے کلام پڑھنے والے کو اگر ہمنوا بھی مل جائیں تو سماع کیلئے سماع بندھ جاتا ہے۔ چنانچہ داؤدؑ کی ہم نوائی کیلئے پہاڑوں اور پرندوں کو حکم باری تعالیٰ ہوا: یٰجبال اوّبی معه والطیر پھر تو وہ مجلس سماع برپا ہوئی کہ کائنات کا ذرہ ذرہ جھوم اُٹھا' الا ماشاء اللہ ۔ یوں معجزہ فضل وفعل الٰہی ہے۔لیکن حضرت داؤدؑ کے سنگت اور جگت میں پہاڑوں اور پرندوں کو ایک سرتال میں تسبیح کے حسن بے مثال کو پروردگار نے وکنا فٰعلین فرما کر بطور خاص اپنا کارنامہ بتایا۔سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔خوش گلوئی کے

ساتھ ساتھ زبور بھی چاہئے عمدہ کلام اور پاکیزہ لحن روح کی غذا ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے روایتی اور فنی تعلیمی اداروں کے ساتھ ہندوستانی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھانے والے ادارے قائم کیے ہیں۔جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:

1۔یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن 1948۔2۔سنٹرل اڈوائزی بورڈ آف آرکیالوجی۔1949

3۔انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن۔1950۔ 4۔دلی پبلک لائبریری۔1951

5 ۔انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور۔1951۔

6۔سکینڈری ایجوکیشن کمیشن۔1952

7۔نیشنل آرٹ ٹریژرس فنڈ۔ 1952۔ 8۔سنگیت ناٹک اکاڈمی ۔1952' 9۔سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ روڑکی۔ 1953۔' 10۔کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ۔ 1953' 11۔نیشنل انسٹی ٹیوٹ پلانی۔1953۔ ' 12۔یونیورسٹی گرانٹ کمیشن۔1953

13۔للت کلا اکاڈمی ۔1954' 14۔ساہیتہ اکاڈمی ۔ 1954

15۔نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز۔ نئی دہلی۔ 1954۔

16۔انڈین ہسٹریکل ریکارڈ کمیشن میسور۔1955

17۔انڈین ہسٹریکل ریکارڈ کمیشن، جئے پور۔

18۔ال انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کی تشکیل نو۔

19۔سنٹرل اڈوائزی بورڈس آف ایجوکیشن دہلی،کلکتہ،کٹک،

سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کی تشکیل اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک سچے مسلمان ہونے کے باوجود وہ شدت پسند نہیں تھے۔ بلکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی بے پناہ قدر کرتے اور اُس کا تحفظ کرنے اور اُسے فروغ دینے کے لئے اس طرح کی کامیاب سعی کی ۔کیونکہ سنگیت ناٹک اکاڈمی ،موسیقی رقص اورڈرامے کے تحفظ اور فروغ دینے کے مقصد سے قائم کیا گیا ایک قومی ادارہ ہے۔

پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کی صدارت میں 28 جنوری 1953 کو پارلیمنٹ ہاوز میں سنگیت ناٹک اکاڈمی کی ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی تھی ۔اس تقریب میں پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو بھی شریک تھے۔اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بحیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ:

''موسیقی ،ڈرامہ اور رقص، ہندوستان کا قیمتی ورثہ ہے یہ ہمیں عزیز ہے اسکی ترقی ضروری ہے۔ہمیں اپنے خاطر نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے ثقافتی ورثے میں ہماری شراکت داری کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔''

مولانا آزاد کی مذکورہ تمام کوششوں کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ صدیوں قدیم ہندوستانی تہذیب کی بقاء کے لئے آزاد نے جو کوشش کی ہے وہ کلیدی اور کامیاب کوشش ہے جو ملک کے لئے آج بھی ثمر آور ثابت ہورہی ہے۔

☆☆☆

محمد عبدالعظیم نعمان
متعلم: عالم دوم
جامعہ نظامیہ، شبلی گنج، حیدرآباد

نعت گوئی کے اِرتقاء میں علماء جامعہ نظامیہ کا حصہ

اُردو میں نعت گوئی اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان ہے ، نعت عربی لفظ ہے عام طور پر وصف و بیان کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے البتہ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو زبان تک پہونچتے پہونچتے یہ لفظ ایک خاص مفہوم سے وابستہ ہوگیا یعنی اصطلاحًا نعت اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر رسول اللہ ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتا ہے اور اپنے آقا کی تعریف وتوصیف بیان کرتا ہے ۔سب سے پہلے نعت کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے وصف کے لئے حضرت علیؓ نے استعمال کیا ۔شاعری میں نعت گوئی کا فن دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں کئی ایک وجوہ سے خصوصیت کا حامل اور کافی اہمیت وفوقیت رکھتا ہے کیونکہ نعت کا موضوع آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے ہے، اصناف سخن میں موضوع کے اعتبار سے ''حمد'' کو اولیت حاصل ہے اس کے بعد ''نعت'' رسول اللہ ﷺ کو۔نعت گوئی اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک ہر زبان کے شعراء کا وطیرہ رہا ہے۔اردو زبان میں نعت شریف کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، ہر دور میں ہر علاقہ میں اس میں اضافہ ہوتا ہی گیا اس کے برخلاف دیگر اصناف سخن کبھی عام ہوتے گئے اور کبھی مفقود ہوتے گئے ۔نقادانِ فن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نعت گوئی بڑا مشکل مرحلہ ہے ۔نعت گو کو خدا اور اس کے رسول کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہمارے شعراء مدح نبی کریم ﷺ میں پیچھے نہیں رہے بلکہ نعت گوئی کو باعثِ نجات ومغفرت جان کر اس وادیِ دشوار سے گزرتے ہی رہے اور گزرتے ہی رہیں گے۔ہم سب یہ بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس دشوار گذار گھاٹی سے بغیر کسی لغزش کے گزر جانا ہر کسی شاعر کے بسکی بات نہیں، اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ کے فضل و کرم کے صدقے میں سرزمین ہند میں جنم لینے والی مشہور ومعروف ہستیوں نے اس مرحلہ کو آسان بنالیا جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: امام احمد رضا خاں، خواجہ میر درد، علاّمہ شبلی نعمانی، جلیل مانکپوری، مولانا کوثر نیازی، خواجہ بیدم وارثی، علامہ اقبال، عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری، الطاف حسین حالی، پیر مہر علی شاہ، عبدالستار نیازی، حفیظ جالندھری، مولانا ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی، مولانا ضیاء القادری، احسان دانش، اقبال سہیل، علامہ شائق حیدرآبادی، مولانا بیکل اُتساہی، حضرت عاصم، مولانا علی افسر، اوج یعقوبی، مولانا بسمل ابوالعلائی، محسن کاکوری رحمھم اللہ تعالی عنھم اجمعین وغیرہ۔

اردو میں نعت گو شعراء کی تعداد اور ان کے کلام کا انداز و

طریق روایات کی روشنی میں وہی ہے جو قدیم زمانے میں تھا البتہ مولانا حالی اور آپ کے بعد آنے والوں نے اس میں قومی وملی رنگ کو بھی شامل کر دیا اب نعت میں عقیدت ومدحی کے مضامین کے ساتھ اجتماعی یا انفرادی فریاد' جذبات ومسائل کو بھی دربارِ رسول میں پیش کیا جانے لگا۔ ماضی قریب کے شعراء میں محسن کاکوری کو نعت کہنے میں ملکہ حاصل ہے۔ جہاں پر سرزمین ہند کے عاشقان رسول صلّی اللہ علیہ والہ وسلّم نے بارگاہ نبوی ﷺ میں اپنے کلام کو پیش کیا وہی پر سرزمین دکن کی مشہور ومعروف یونیورسٹی ازہر ہند جامعہ نظامیہ کے علماء نے بھی حضور ﷺ کی خدمت میں مدح سرائی فرمائی' جن میں سے چند مشہور و معروف کے نام سرفہرست ہے۔

شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقیؒ' مولانا عبدالقدیر صدیقیؒ' عبدالحمید خاں خیالیؔ' عبداللہ ابن احمد تابؔ' غلام علی حاوی' شیخین احمد شطاری کاملؔ' حضرت سید محمد بادشاہ حسینی لئیقؔ' مظفرالدین معلّی' سید احمد علی شاہ انورؔ' مفتی سید احمد علی صوفی صفیؔ 'امجد حیدرآبادی' صفیؔ اورنگ آبادی' رحمت اللہ خاں رحمتؔ' غلام محمد غوث مدنی' غلام قادر صدیقی صادق' اسماعیل شریف ازل' سید شاہ سیف الدین' شرفی سیفؔ' صابر زیرکی' سردار بیگ شمیمؔ' اسدؔ انصاری' روحیؔ قادری' عطاء اللہ حسینی صدیقیؔ' ندیم مغربی رحمھم اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین وغیرہ۔ جن میں سے چند ایک اردو نعت گو شعراء کو یہاں تفصیلی طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

جامعہ نظامیہ کے اردو نعت گو شعراء:

حضرت شیخ الاسلام مو لانا حافظ وقاری امام محمد انوار اللہ فاروقیؒ : خان بہادر فضیلت ۴؍ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ کو بمقام ناندیڑ (مہاراشٹرا) میں پیدا ہوئے۔ مولانا ایک عالم' صوفی' مفکر' دانشور' فلسفی' متکلم' فقیہ' محدث' اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ادیب وشاعر اور ایک نابغہء روزگار شخصیت تھے۔ مولانا کے علمی وادبی کارناموں میں ان کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے' وہ اپنی شاعری میں انورؔ تخلص فرماتے ہیں' مولانا انوار اللہ شاہؒ نے شعر گوئی کا آغاز انوارِ احمدی (جو عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈوبی نظر آتی ہے) کے منظوم ترجمہ سے کیا جو بانسٹھ بندوں پر مشتمل مسدس کی ہیت میں ہے۔ انوارِ احمدی کے شعری متن کے علاوہ مولانا کا ایک اور مجموعہء کلام ''شمیم الانوار'' کے نام سے موسوم ہے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران آپ نے جو اشعار لکھے' ان کا ہر لفظ حبّ رسول کی صدا دیتا ہے' جس کی تائید مولانا مفتی رکن الدینؒ کے اس قول سے ہوتی ہے۔

''مولانا علیہ الرحمہ باضابطہ شاعر نہیں تھے' تصوف سے لگاؤ کے باعث جو خیالات اور جذبات اٹھتے تھے' ان کو کبھی کبھی نظم فرما دیا کرتے تھے' آپ کا کلام یقیناً عام مذاق کے مطابق نہ ہوگا' البتہ وہ لوگ جو صوفیانہ مذاق رکھتے ہیں ضرور اس سے حظ اٹھائیں گے' کلام کا اکثر حصہ توحید و نعت میں ہے''۔

بطور نمونہ آپ کی شاعری میں نعت کے چند اشعار ذکر کئے جاتے ہیں:۔

پس وہ نور پاک رب العالمین پیدا ہوئے
مبدأ کونین وختم المرسلین پیدا ہوئے
کی بذات خود خدا نے نعت جب محبوب کی

پھر ثنا دل سے کریں کیوں کر نہ سب محبوب کی
وحشتِ آدم گئی نامِ شہ لولاک سے
مردہ زندہ ہو گئے تاثیر نام پاک سے

مولانا کے شعری ذوق کی بابت ابوالخیر کنج نشین رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

''وہ اپنے عہد کے علمی ہمہ دانست بہت اچھے نمونہ تھے اور عربی' فارسی اور اردو کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے''۔

(جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی و ادبی منظر نامہ، مصنف: ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان قادری احساس، سن اشاعت ۲۰۱۶ء۔ ۱۴۳۸ھ ص ۶۰ تا ۶۱)

مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرتؔ: سن ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار حضرت عبدالقادر صدیقی اور اپنے نانا حضرت خواجہ محبوب اللہ سے حاصل کی۔ تصوف اور شعر و سخن کے لئے حضرت محبوب اللہؒ کے آگے زانوئے ادب طے کیا۔ مولانا حسرتؔ نے جامعہ نظامیہ کے ناظم تعلیمات اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ عربی و دینیات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دی۔ ماضی میں جامعہ کی سرکردہ شخصیات میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے ادب' شاعری' اسلامیات اور دیگر فنون میں اپنی قابلیتوں کا سکّہ جما کر اپنی تصانیف اور فیض یافتگان کے ذریعہ سے اپنی شمع فروزان کو باقی رکھا ہے' دکن میں جامعہ نظامیہ کی تاریخ کو ان پر برابر فخر و ناز ہے جن کی ہمہ جہتی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔ آپ ایک زبردست عالم' ماہر فاضل' قابل قدر مرتب و مصنف کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کے ایک بڑے نامور صوفی شاعر تھے۔ جنہوں نے اردو کی ادبیات میں اپنے جواہر پاروں کے ذریعہ گراں قدر اضافہ کیا۔ اور تاریخ دکن میں آپ عظیم عالم و فاضل اور ایک بہترین قادرالکلام اردو نعت گو شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ذیل میں حسرتؔ کے نعتیہ چند اشعار دئے جاتے ہیں:۔

شہنشاہِ کون و مکاں ہیں محمدؐ
دوعالم کی روح رواں ہیں محمدؐ
محمدؐ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا
کلید ظہور جہاں ہیں محمدؐ
محمدؐ سے ہے رونقِ بزمِ گیتی
بہار ریاض جہاں ہیں محمدؐ

(جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی و ادبی منظر نامہ، مصنف: ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان قادری احساس، سن اشاعت ۲۰۱۶ء۔ ۱۴۳۸ھ ص ۱۱۲)

سید شاہ شیخین احمد قادری شطاری کامل: (شیخین احمد نام، قادری شطاری نسبت، کامل تخلص ہے) ۔۲۳/ صفر ۱۳۲۳ھ کو حیدرآباد دکن کے محلّہ دبیر پورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ مصلح امت' پیرومرشد' واعظ و خطیب' ادیب اور ایک زبردست قادر الکلام مشاعر تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری پر کچھ لکھنے سے پہلے خود اُن کے مجموعہ کلام کی ابتداء میں موجود اُن کی تحریر کا ایک اقتباس مختصراً ملاحظہ ہوں:۔

''میں شاعر ہوں نہ شاعری میرے لئے وجہ امتیاز' البتہ کبھی کبھی میں نے اپنی جن وارداتوں کو نظما لیا' انہیں اپنے احباب کے مسلسل اصرار پر شائع کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں''۔

مگر اس سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ حضرت قبلہؒ نے نہ صرف معیاری شاعری کی ہے بلکہ مختلف اصناف سخن میں بھی اپنی طبع خداداد جوہر دکھلائے اور حمد و نعت اور منقبت کے علاوہ قطعات، رباعیات، مسدس اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی کہی ہوئی ایک نعت کا مطلع و مقطع یوں ہے:۔

حیات عشق کا اک سرمدی پیام آیا
نبی کے نام پہ مرنا بھی کتنا کام آیا
قدم حضور کے دیکھو تمہارا سر دیکھو
جنوں میں کب سے یہ کاملؔ خیال خام آیا

حضرت کاملؔ شطاریؒ کے کلام کی خصوصیات میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ اس بلا کی سادگی و پرکاری پائی جاتی ہے کہ ان کے دریائے سخن میں حد درجہ روانی ہے جس میں کہیں رکاؤ اور ٹھہراؤ نہیں ہے اور باتوں باتوں میں وہ بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور اس پر لطف یہ کہ بڑا آسان لب ولہجہ ہوتا ہے۔ نیز رواں، سادہ اور عام فہم اسلوب ہوتا ہے۔

(جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی و ادبی منظر نامہ، مصنف ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان قادری احساس، سن اشاعت ۲۰۱۶ء۔ ص ۱۷۵ تا ۱۸۱)

سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی: ان کا نام شعری و ادبی دنیا میں امجدؔ حیدرآبادی کے نام سے نہ صرف مشہور و معروف بلکہ ایک بڑا نام ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں ہوئی، امجد کے والد حضرت عبدالرحیم صوفی تھے۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپ کی شاعری کا آغاز ہوا چنانچہ تمام اصناف سخن میں آپ نے شاعری کی ہے مگر خصوصیت کے ساتھ رباعی گوئی ان کی پہچان بن گئی ہے، اس لئے وہ شہنشاہِ رباعیات کہلائے۔ نظم و نثر میں انہوں نے متعدد کتابیں تحریر فرمائیں اور علمی کام کو معیاری طور پر انجام دیا۔ نعت گوئی کے ارتقاء میں جامعہ نظامیہ کے قابل فخر سپوت سید امجدؔ حیدرآبادی کا نام سرفہرست ناموں میں ایک ہے۔ امجدؔ حیدرآبادی کا نام نہ صرف جامعہ نظامیہ کے شعراء میں قدر وعزت کے ساتھ لیا جاتا ہے بلکہ حیدرآباد کے مشہور اساتذہ سخن بھی امجد حیدرآبادی کے فن کے قائل تھے۔ امجدؔ حیدرآبادی کی شاعری کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ماہر لسانیات سید محی الدین قادری زور تحریر کرتے ہیں کہ:

''حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اُردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں کے رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر پیدا ہوئے تھے جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا اور جن کی ہندوستان گیر شہرت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوئی''۔

(مجلّہ انوار نظامیہ، رباعی کے ارتقاء میں علماء جامعہ نظامیہ کا حصہ، مولوی ابن حیدر، سن اشاعت ۲۰۱۲ء، ص ۹۲)

..... حضرت امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیات میں قرآن وحدیث اور تصوف وطریقت کے مسائل اور نعت کے اشعار بھی ملتے ہیں، چند نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

رخ مہر ہے، قد خط شعائی کی طرح
ہے گلہ امت میں وہ راعی کی طرح

اس خاتم انبیا ء کا آخر میں ظہور
ہے مصرع آخر رباعی کی طرح

محمد بہاء الدین صفیؔ : بہبود علی نام اور صفیؔ تخلص ہے' ۱۶۔ فبروری ۱۸۹۳ء کو اورنگ آباد کے جونا بازار میں ولادت ہوئی۔ صفی اورنگ آبادی کو بچپن ہی سے فنونِ لطیفہ سے لگاؤ تھا اور شعر وشاعری کا فطری ذوق تھا۔ سترہ برس کی عمر سے آپ نے شاعرانہ زندگی کی طرف رخ کیا۔ اس ہونہار سپوت کا رجحان دیکھ کر آپ کے والد بزرگوار نے ''صفی'' کے تخلص سے آپ کو سرفراز فرمایا۔ ابتدائی شاعری کے مراحل جیسے بھی طے ہوئے، ہوئے لیکن جب زمانے نے اپنا اثر ڈالا اور رسم ورواج کی ہوا لگی تو آپ نے اپنے کہے پر کسی نہ کسی سے اصلاح کی ضرورت محسوس کی' چنانچہ انہوں نے ضیاؔء دہلوی' ظہورؔ دہلوی' فروغ اور پھر حضرت کیفیؔ جیسے جید اساتذہ سخن سے رجوع کیا اور ان سے اصلاح لی مگر زیادہ تر کیفیؔ سے انہوں نے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ نے تقریباً شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن غزل کہنے پر زیادہ زور دیا ہے اور اس میں بڑی عالم گیر شہرت حاصل کی ہے۔ اردو زبان کی شستگی، خیالات کی ادائی، روزمرّہ کا صحیح استعمال، بے ساختہ پن، لفظوں کی ترتیب کی خوبصورتی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ نقائض شاعری سے آپ کا کلام پاک ہے۔ آپ کے شعر اس قدر برجستہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں کہ ادھر ''زبان سے نکلے اور دل میں اتر گئے''۔ کلام میں اس صفت کا پیدا ہونا نہایت مشکل ہے۔ لفظوں کی بندش اور اس کی سادگی اگر شعر میں ہو تو سننے والوں کے دل میں محفوظ ہے۔ حضرت داغ دہلوی کے رنگ میں حضرت صفیؔ مرحوم ایک کامیاب شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں میں استاد سخن حضرت میرؔ اور جہاں استاد حضرت داغؔ دہلوی کے طرزِ کلام کی نمایا جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تسکین عابدی یوں رقم طراز ہیں۔

''وہ غزل کو صرف غزل کی حیثیت سے کہتے ہیں' جزبات بالکل فطری' معاملہ بندی میں لطافت' زبان میں سلاست' محاورہ میں چستی اور روزمرہ نہایت صاف ہوتا ہے' حد درجہ تیز' پرگو' ذہین' طباع' منکسر المزاج' لاابالی اور رند مشرب یار باشی میں فرد دل باختگی میں اپنی آپ نظیر' رات کے راجہ' اگر آپ کی گل افشانی گرفتار دیکھنی ہو تو کوئی رات کو دیکھے۔''

ذیل میں صفی اورنگ آبادی کے چند نعتیہ اشعار دئے جاتے ہیں:

خدا کو ہم نے پہچانا خدا ہے
محمدؐ پے تصدق آپ کا ہے
سرِ محشر یہ کیسا ماجرا ہے
جسے دیکھو تم ہی کو دیکھتا ہے
نہیں کوئی کسی کا یا محمدؐ
غریبوں کو تمہارا آسرا ہے

(فردوس صفی' از حکیم بہبود علی صفی اورنگ آبادی، ناشر: ادارہء اشاعت ادب۔ کراچی، سن اشاعت ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۳)

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اور بھی کئی نعت گو شعراء نے جامعہ نظامیہ سے کلی یا جزوی طور پر تعلیم حاصل کی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بدر سلطانہ
حیدرآباد

پروفیسر اشرف رفیع کی شاعری کی مختلف جہات

(نظموں کے حوالے سے)

پروفیسر اشرف رفیع اُردو ادب کی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ وہ ادبی حلقوں میں ایک استاد، محقق اور نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں ۔لیکن وہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع کا اصل نام اشرف النساء ہے۔ قلمی نام اشرف رفیع اور تخلص اشرف ہے۔یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول سے حاصل کی۔۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ویمنس کالج سے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے بعد ۱۹۶۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے اردو کیا اور جامعہ عثمانیہ سے ''نظم طبا طبائی کی حیات اور علمی وادبی کارناموں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ داخل کر کے ۱۹۷۱ء ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر اشرف رفیع کو شعروشاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ان کے والد محمد رفیع الدین صدیقی اچھے شاعر تھے۔ اشرف رفیع کے شعری ذوق کو جلا ان ہی سے ملی اور طالبِ علمی کے زمانے میں جب کہ وہ نہم جماعت کی طالبہ تھیں انہوں نے اپنی پہلی نظم ''شام'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ابتداءٹولی چوکی (حیدرآباد) میں انہوں نے اپنے کلام پر خاورنوری سے اصلاح لی۔ان کے انتقال کے بعد مولانا معزالدین قادری سے اصلاح لیتی رہیں۔ اس طرح شعر کہنے کا سلسلہ چل پڑا جو آج بھی جاری ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع نے کئی موضوعات پر قلم طرازی کی ہے۔جن میں دکنیات،لسانیات اور تحقیق وتنقید شامل ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع نے اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد اول ودوم) پر نظر ثانی کی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے فاصلاتی ایم۔اے پروگرام کی درسی کتاب'' کلاسیکی شاعری'' کو مرتب بھی کیا۔

تدریسی زندگی کا آغاز پروفیسر اشرف رفیع نے ۱۹۷۰ء میں ونیتا مہاودیالیہ سے بحیثیت اردو لکچرر کے کیا۔ وہ ۱۹۷۷ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئیں،۱۹۸۹ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں اور ڈسمبر ۱۹۹۷ء میں وظیفۂ حسن پر سبکدوش ہوئیں۔تدریس سے سبکدوش ہونے کے باوجود آج بھی علم وادب کی ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع بچوں کے ادب اور تعلیمِ بالغان سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔حکومت کی جانب سے چیف ایڈیٹر رہ کر بچوں کے لیے کئی کتابیں ایڈٹ کروائیں۔وہ نصابی کمیٹی کی چیر پرسن اور تعلیمِ بالغاں کے ایڈیٹوریل بورڈ کی ممبر بھی رہیں۔علاوہ ازیں وہ کئی ادبی اور تہذیبی انجمنوں واداروں سے وابستہ ہیں ۔ پروفیسر اشرف رفیع کی علمی وادبی خدمات کے پیش نظر انہیں ۱۹۹۴ء میں ''امتیازِ میر'' جیسے باوقار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ان کی کئی کتابوں پر مختلف اکاڈمیوں کی جانب سے ایوارڈس عطا کئے گیے۔

ان کی تصانیف میں نظم طباطبائی ۱۹۷۳ء، تلخیص عروض وقافیہ ۱۹۸۲ء، مقالاتِ طباطبائی ۱۹۸۴ء، دکنی مثنویوں کا انتخاب ۱۹۹۰ء، تلاش زبان وادب ۱۹۹۹ء کے علاوہ دو شعری مجموعے ''عودِ غزل'' ۱۹۸۳ء اور'' اور پھر سے جینا ہوگا'' ۲۰۰۴ء ہیں۔

'' پھر سے جینا ہوگا'' پروفیسر اشرف رفیع کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں نعتیں، مناجات، نظمیں، غزلیں، ثلاثی قطعات اور سانیٹ شامل ہیں۔

نعتیہ نظموں میں '' اے حبیبِ کبریا اے رحمت للعالمین''، ''محمد ہمارے رسولِ خدا ہیں''، ''نعتِ رسولِ مقبولؐ'' اور ''موری نیّا پار لگا دو'' میں پروفیسر اشرف رفیع نے پیغمبرِ اسلامؐ کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔جذباتِ عقیدت کے اظہار کے لیے اسلامی تلمیحات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔'' موری نیّا پار لگا دو'' اس گیت نما نعت میں حضور رسالتمآبؐ میں التجا کرتے کہتی ہیں۔

رب کے اپنے تم ہو دلارے
نبیوں کی آنکھوں کے تارے
سارے جگ کے تم ہو پیارے
گمراہوں کو راہ پہ لا دو
موری نیّا پار لگا دو
نبی جی

غیروں نے ہے ڈالا ڈیرا
درد والم نے ہم کو گھیرا
پگ پگ چھایا گھور اندھیرا
اپنے کرم کی جوت جگا دو
موری نیّا پار لگا دو
نبی جی

پروفیسر اشرف رفیع نے ماضی وحال، غریبی، مہنگائی، فسادات، ظلم وبربریت، غریبوں کا استحصال، گھر، خاندان، شادی بیاہ، جہیز اور اولاد کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

نظم '' کلیاں''، معصوم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی تربیت کے موضوع پر لکھی گئی ہے ۔کہتی ہیں کہ لڑکیوں میں صلاحیتوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ۔اگر ان کی بہتر تربیت ہو تو وہ بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتی ہیں۔آج ان معصوم لڑکیوں پر جبر کیا جاتا ہے۔ظلم ڈھایا جاتا ہے۔یہ کلیاں اپنے آنے والے کل سے بے خبر ہیں۔خود پر ہونے والے ظلم وجبر سے انجان ہیں۔اگر ان پر کالے بھونروں کی نظر پڑ جائے تو یہ معصوم کلیاں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائیں گی یا بکھر کر رہ جائیں گی۔جب کہ یہی وہ کلیاں ہیں جو مستقبل میں گلشن کو مہکائیں گی۔اس لیے

آج ان کی حفاظت اوران کی رکھوالی ضروری ہے۔
ان ننھی کلیوں کو دیکھو / کیسی خوش ہیں / جھوم رہی ہیں
آنے والے کل سے بے خبر/گرم ہوا کے جھونکوں سے/
یہ کل مرجھائیں گی
وقت کی تپتی آگ میں جل کر/ راکھ بنیں گی
یا پھر کالے بھونرے / کھلنے سے پہلے ہی
ان کا رس پی لیں گے / یا بکھریں گی روش روش پر
پامالی سے خاک بنیں گی / پنکھ لگیں گے اڑ جائیں گی
یہ کلیاں بے چاری / ان کی کوئی کرے رکھوالی
شاید یہ کل / گلشن کو مہکائیں گی

''چاہِ بابل''''ایک سوال'' ''مجبوری''''پیاس''
''عذاب'' وغیرہ نظموں میں پروفیسر اشرف رفیع نے سماج کے سب سے جلتے ہوئے مسئلے یعنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کو موضوع بنایا ہے۔ باوجود ساری خوبیوں کے جہیز، لین دین، خوب سے خوب تر کی جستجو کی وجہ سے لڑکیوں کا رشتہ نہیں ہو پاتا۔ والدین اپنی بیٹیوں کے لیے بہتر رشتے تلاش کرتے کرتے ان کو دلہن بنے دیکھنے کی آرزو لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ نظم ''عذاب'' میں انہوں نے ایسی ہی لڑکی کی بپتا بیان کی ہے جس کی ماں نے بڑی آرزوؤں اور ارمانوں کے ساتھ کتان کی ساڑی کو سنبھالے رکھا تھا کہ اس کی بیٹی یہ ساڑی پہنے دلہن بن کر اپنے گھر چلی جائے۔ المیہ یہ ہے کہ اس انتظار میں وہ خود اس دنیا چلی گئی۔ لیکن اس کی آرزو پوری نہ ہوئی۔

بیش قیمت کتان کی ساڑی / جس کو ماں نے / صندوق میں
بڑے جتن کے ساتھ / سنبھال رکھا تھا
دھوپ سے / پانی سے / نمی سے
چاند کی کرنوں سے / بچا بچا کے رکھا تھا
جیسے خوشبوؤں میں بسی ہوئی / کوئی امیر کی دلہن
رنگ مہتابی / نرم جیسے گلاب
سرخ ململ میں / ڈھنگ سے لپٹی ہوئی
آج جب اس کو دیکھتی ہوں میں / ہوک سی دل میں ایک اٹھتی ہے
ایسے لگتی ہے جیسے / کوئی کنواری بڑھیا / جوان سی بیوہ
ماں اگر دیکھتی تو / نہ جانے
اس کے دل پر / عذاب کیا ہوتا

پروفیسر اشرف رفیع کے نزدیک مرد اور عورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ وہ دونوں کو اپنے اپنے حدود میں یکساں مانتی ہیں۔ لیکن سماج مردوں کو اعلیٰ درجہ و مقام دیتا ہے۔ اور عورتوں کے ساتھ امتیاز روا رکھتا ہے۔ وہ پوچھتی ہیں جب قدرت نے دونوں کو ایک جیسا بنایا ہے تو پھر یہ اختلاف کیوں؟ کیوں مرد کی باتیں اس کے احکامات قابلِ قبول ہو جاتے ہیں۔ اور کیوں عورتوں کی باتیں نا قابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔ نظم ''سچ'' میں عورت اور مرد کے اس اختلاف پر لکھتی ہیں:

نہ میرے پاؤں کی انگلی انگوٹھے سے بڑی ہے
نہ میرے ہاتھ کی وہ لکیر / کہیں سے بھی کٹی ہوئی ہے
پھر تم کیوں میرے ساتھ نہیں ہو؟
تم میں اور مجھ میں / یہ انتر ایسا کیوں ہے؟
میں جو کہتی ہوں وہ غلط ہے / تم جو کرتے ہو وہ سچ ہے

جب کہ عورت نے ہر قدم اور ہر محاذ پر مرد کا ساتھ دیا

ہے۔اور آج بھی مرد کے قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے۔اس مہنگائی کے دور میں گھر کی معاشی حالت بہتر بنانے میں مردوں کے دوش بدوش اپنے گھروں سے نکل پڑی ہیں۔گھر جہاں انہیں چین وآرام نصیب تھا۔زندگی کو سدھارنے اور بہتر بنانے کی خاطر چین وسکون سب بھول گئیں ہیں۔نظم ''پھر سے جینا ہوگا'' میں اشرف رفیع صاحبہ ملازمت پیشہ خواتین کے تعلق سے لکھتی ہیں:

سورج کی کرنوں کے ساتھ / چلتے، جلتے رہے وہ پاؤں
پائل جس کے لئے ترس کر / چھم چھم کرنا بھول گئی
کاجل سے کجرائی آنکھیں / گرد سمیٹیں، بھیگ گئیں
ہاتھوں سے مہندی کی لالی / چھوٹی کب کے
لمبے لمبے بالوں کو سلجھانے والی / انگلیوں میں / اور ہتھیلی کے دامن میں
پڑ گئے کالے کالے چھالے / بھول گئی وہ ٹھنڈی چھاؤں
شام ہوئی جب / وہ بھی لوٹی / اپنے گاؤں
رات نے لوری دی / تو سوئی
صبح ہوئی جب آنکھیں کھولیں / دل نے کہا
''ہائے رے! پھر سے جینا ہوگا''

نظم ''روپ بہروپ'' میں پروفیسر اشرف رفیع نے ایسی خواتین اور لڑکیوں پر چوٹ کی ہے جو اپنی نسوانیت چھوڑ مردوں کی تشبّہ اختیار کر لیتی ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع اپنے وجود پر اور اپنے عورت ہونے پر فخر کرتی ہیں کہ میں اپنی ہستی سے خوش ہوں۔ مجھے اپنے عورت پن پر ناز ہے۔کیونکہ میں نے رام کو جنم دیا ہے۔کرشن کو جنم دیا ہے۔میں ہر پیغمبر کی ماں ہوں۔ میں مریم ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ پھر کیوں میں کسی اور کا روپ بھروں اور ایسا روپ بھر کر میں خود اپنی توہین کیوں کروں:

میں خوش اپنی ہستی پر ہوں / ناز ہے مجھ کو اپنے پن پر
رام کرشن کو جنم دیا ہے / ماں ہوں ہر پیغمبر کی بھی
میں مریم ہوں / جس کا کوئی باپ نہیں
میں سیتا ہوں / رام کی طاقت
پینٹ اور شرٹ پہن کے / پھر کیوں / اوروں کا سا روپ بھروں میں
پھولوں جیسے ہونٹوں کو / کیوں مرغولوں سے زرد کروں
میرا نشہ ہے ان پر چھایا / ساغر میں کیوں
غرق رہوں میں / اوروں کا سا روپ بھروں
اپنی خود توہین کروں

اولاد متاعِ حیات ہی نہیں بلکہ نعمتِ خدا بھی ہوتی ہے۔اور اس کی چاہ سب کو ہوتی ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع کہتی ہیں کہ اگر یہ مل جائے تو میرا آنگن بھی کھلِ اُٹھے گا اور میرے بھی ہونٹوں پہ لوریاں مہکیں گیں۔لیکن میرا دامن تو خالی ہے۔'' آرزوئے ناتمام'' اور ''تہی دامن'' وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔

وہ حسین انساں / جو میرے وجود میں گُم ہے
ہر نفس اس کی جستجو ہے مجھے
وہ جو آئے تو / کھلِ اُٹھے آنگن
میری آنکھوں میں / بجلیاں چمکیں
میرے ہونٹوں پہ لوریاں مہکیں / میرا دن چٹکیوں میں گزرے گا
خواب ترسیں گے میری آنکھوں کو
چاند سورج پہ / مسکراؤں گی

دنیا میں کہیں تہی دامنی کا شکوہ ہے۔اولاد کی چاہ میں

منتیں مانگی جاتی ہیں۔لیکن اسی دنیا میں بعض ایسے بھی ہیں جو اس نعمت کو جوان کے لیے ان چاہی ہوتی ہے' کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیتے ہیں۔لکھتی ہیں:

کتنے سارے گود ہیں خالی
کتنے آنچل بھیگ رہے ہیں
کچرے کے ہیں ڈھیر میں بچے

پروفیسر اشرف رفیع نے خواتین کے مسائل پر کئی نظمیں لکھیں ہیں ۔ ڈاکٹر عسکری صفدر پروفیسر اشرف رفیع کی شاعری میں نسائی حسیت اور خواتین کے مسائل کے ابلاغ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

'' اشرف رفیع کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ حیدرآباد کی پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے نسائی حسیت پر قلم اٹھایا۔دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا۔''

(ڈاکٹر عسکری صفدر،حیدرآباد کی اردو شاعرات،صفحہ۱۱۲)

آج کا دور خلوص و ہمدردی سے کوسوں دور ہے ۔ شرفاء شرافت کی آڑ میں چہرے بدل کر دھوکہ ،مکر اور فریب کر جاتے ہیں۔نظم '' نظر فریب'' میں انہوں نے جھوٹی تہذیب کے علم برداروں پر طنز کے تیر چلائے ہیں ۔ اور نظم '' سنہری کرسیاں'' میں ان عہدیداروں پر ضرب لگائی ہے جو خاموش تماشائی بنے مظلوموں پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز تک نہیں اٹھاتے ۔ انصاف کے رکھوالے یہ وکیل جو کالے گون پہنے ہوئے ہیں ان کے دل بھی کالے ہیں ۔ انصاف کا ترازو کمرۂ عدالت میں صرف زینتِ اجلاس ہے ۔ قرآن اور گیتا جیسی مقدس کتابیں جزدانوں میں صرف دکھاوے کے لیے رکھی گئی ہیں ۔ یہاں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔اور یہ سنہری کرسیوں والے مئے و مستی میں مصروف ہیں ۔ پروفیسر اشرف رفیع کہتی ہیں کہ انصاف چاہیں تو آخر ہم کس سے انصاف چاہیں:

وکیلوں کے گون سب خود ہی کالے
کسے منصف کریں / سب گونگے بہرے
عدالت میں ترازو، زینتِ اجلاس
نہ گیتا ہے نہ قرآن
ہیں جزدانوں میں ان کی صرف جلدیں
کٹورے آنسوؤں کے خالی خالی / دلِ آشفتہ آتش بار و سوزِ
نالۂ شب گیر/ دل سنگیں
سنہری کرسیاں خنداں لب و مست

پروفیسر اشرف رفیع کہتی ہیں کہ آج صلاحیتوں کی کوئی کمی نہیں ہے مگر محنت ، ایمانداری ، خودداری اور بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود کئی افراد ایسے ہے جو اپنے حق سے محروم ہیں ۔ کیونکہ مکر و فریب سے بعض افراد ان کی حق تلفی کرتے ہیں اور دنیا ایسے ظالموں کو سراہتی ہے' ان کی عزت کرتی ہے ۔ کہتی ہیں بعض مہربان بھی ہوتے ہیں جو ہمارے اطراف و اکناف بستے ہیں ۔ان مہربان لوگوں میں کوئی خندہ رو ہے کوئی مہ جبین ہے ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن سے کبھی سامنا ہو جائے تو دُعائیں بھی دیں گے اور ستائش بھی کریں گے ۔مگر یہ جو ہمارے مہرباں ہیں بظاہر اُجلے نظر آتے ہیں مگر ان کے باطن میں اندھیرا ہوتا ہے ۔نظم (سانیٹ) '' مہربان'' میں انہوں نے ایسے ہی مہربانوں کا ذکر کیا ہے لکھتی ہیں۔

بہرحال احسان کرتے ہیں ہم پر کبھی دوستی سے، کبھی دشمنی سے
کبھی جان و دل سے، کبھی بے دلی سے
کبھی موت سے اور کبھی زندگی سے
الجھتے چلے جاتے ہیں ہر قدم پر
غلط گوئی کی معذرت بھی کریں گے
اگر اتفاقاً کبھی سامنا ہو
دعائیں بھی لے لو ، ستائش بھی سن لو
نمائش کی خاطر جئیں گے مریں گے
چھپائے ہوئے آستینوں میں کالے
کوئی ہم نفس ہے کوئی ہم نشیں ہے
کوئی خندہ رُو ہے کوئی مہ جبیں ہے
یہ باطن اندھیرے، بظاہر اُجالے
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

پروفیسر اشرف رفیع ایک شفیق اور مہربان استاد ہیں۔ قوم کے بچوں کو وہ ترقی کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے بلندیٔ اقبال پر انہوں نے نظم ''شاہین'' لکھی ہے۔ لکھتی ہیں کہ یہ ننھے پرندے آج بے بس، لاچار و مجبور ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان ننھے پرندوں کو جو ابھی اڑنا بھی نہیں جانتے، ان کے لیے کچھ کروں۔ انہیں ایک رنگ دوں۔ ایک روپ دوں۔ اور انہیں اس قابل بناؤں کہ یہ اڑ سکیں۔ میں انہیں پرواز دینا چاہتی ہوں۔ اپنی فکر دینا چاہتی ہوں۔ وہ میری فکر میں اس طرح سما جائیں کہ شاہین بن جائیں، اور آسمانوں کی بلندیوں کو چھو لیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آنے والی صدی ان نونہالوں کی صدی ہو۔ اور یہ شاہین بن کر اس صدی پر چھا جائیں۔

جو ہے دل میں / خیالوں میں
مرے بے داغ پردوں پر / ذہن کے
ابھی وہ ہو نہیں پایا / چل جو بھی ہوا / اچھا ہوا
مگر ننھے پرندوں کا / جو یہ خاکہ ہے کچا سا
اُسے رنگ روپ دے کر / وقت کا شاہین بنانا ہے
صدی جو آنے والی ہے / اسی شاہین کی ہوگی

پرسکون ماضی اور پرشور حال، آج کے سنجیدہ ذہن و فکر رکھنے والوں کا اہم مسئلہ ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں کہ ماضی کا زمانہ نہایت ہی پرسکون زمانہ تھا۔ ہر طرح کا چین نصیب تھا۔ دادی اماں اور نانی اماں کے جن پری، دیو کے قصے تھے۔ آج وہ سب ختم ہوگئے ہیں۔ آج کا انسان ہی دیو، جن، پری، چھل پائی بنا بیٹھا ہے۔ ''نظم ماضی و حال'' میں انہوں نے ماضی و حال کی انہیں حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔

جل پری ، نیلم پری / پریوں کی شہزادی کوئی
دندناتے دیو / اور بوتل کا جن
لمبے لمبے دانت والی وہ چھل پائی بھیانک
پیڑ پر پیپل کے شیطانوں کا گھر
کوئی ویراں سے محل میں / یا کھنڈر میں / جن و شیطان کا بسیرا
جھٹ پٹے کے وقت / پریوں کا اترنا بام پر
رات کی تاریکیوں میں / کوہ پیکر جن و دیو
اب کہانی نانی ماں کی / اور نہ قصے دادی ماں کے
وہ گئے، یہ بھی گئے / آدمی ہی آدمی ہیں
جن، چھل پائی، پری
شیطان، دیو

نظم ''مُٹھی بھر مٹی'' میں اس ماضی کو بیان کرتی ہیں:

جہاں پگڈنڈیوں میں نرم مٹی ہوا کرتی تھی۔ اب ان کی جگہ ریت سمنٹ اور لوہے نے لے لی ہے کیونکہ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے' ترقی کا دور ہے۔ کہتی ہیں کہ زمانے نے ترقی تو کر لی ہے مگر غریب آج بھی غریب ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے اسے کوئی راحت نصیب نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ مہنگائی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ مہنگائی نے سب کو لاچار اور بے بس کر دیا ہے۔ ایک غریب جس کی آمدنی قلیل ہو وہ اس مہنگائی کے دور میں کیسے جیے۔ جو کچھ بھی کماتا ہے وہ پانی، بجلی، گھر کے کرائے، بچوں کے اسکول کی فیس میں چلا جاتا ہے۔ آٹا، چاول، دال، نمک اور مرچ کہاں سے لائے۔ نظم ''گرانی'' میں ایک غریب بے بس کی حالتِ زار بیان کرتے لکھتی ہیں:

کچھ پانی کے بل میں گئے / اور کچھ بجلی کے بل میں
گھر کا کرایہ چڑھا ہوا ہے / باقی ہے بچوں کی فیس
لاؤں کہاں سے آٹا، چاول / دال، نمک اور مرچ
آج ہے پہلی، ابھی پڑا ہے ایک مہینہ
کیسے جیئے غریب؟

پروفیسر اشرف رفیع کہتی ہیں کہ آج غریب چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کے حالات سدھر جائیں۔ نظم ''کلہاڑی'' میں انہوں نے اُس لکڑہارے کا قصہ بیان کیا ہے جس کی کلہاڑی دریا میں گر جاتی ہے اور ایک جل پری اُسے سونے اور پھر چاندی کی کلہاڑی دیتی ہے۔ لکڑہارے کے انکار پر پری اسے اس کی لوہے کی کلہاڑی دیتی ہے جسے پا کر لکڑہارا مالدار ہو جاتا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع نے لکڑہارے کی اس کہانی کو موجودہ حالات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ آج کے اس پرآشوب اور مہنگائی کے دور میں کوئی بھی محنت اور خوداری سے کمانا نہیں چاہتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ کم وقت اور بنا محنت کئے زیادہ سے زیادہ دولت مل جائے۔ یہ دور حرص اور لالچ سے بھرا دور ہے۔ غربت نے آج ایک غریب کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ آج لکڑہارا کلہاڑی پھینک کر دریا کے کنارے اس امید و آرزو میں بیٹھا ہے کہ کوئی جل پری دریا سے باہر آئے، جس کے ہاتھوں میں چاندی کی کشتی ہو اور اس کشتی میں سنہری کلہاڑی ہو کہ اس سے میری زندگی سنور جائے۔

لکڑہارا کلہاڑی پھینک کر دریا میں / بیٹھا ہے کنارے
امید و آرزو کے بحرِ بے پایاں میں غلطاں ہے
تخیل میں حسیں خوابوں کی دنیا ہے
نگاہیں شاہدِ مستور کی جُویا / کہ شاید
بہ حسنِ عارض و قد / نگاہِ نرگسِ مست
جل پری کوئی نکل آئے
اور اس کے ہاتھ میں / چاندی کی کشتی ہو
اور اس کشتی میں سنہری کلہاڑی

موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی نے بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ انسان نے ایسی ایسی چیزیں ایجادات کی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج انسان نے زمین، ریگزاروں، پہاڑوں، جنگلوں کو اپنے بس میں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے چاند، ستاروں پر بھی کمندیں ڈالی ہیں۔ اس کے باوجود انسان کی جستجو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے۔ اس کے خوابوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی خواہشیں لا انتہا ہیں اور وہ اِن پر تسکین چاہتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کائنات کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہ اَن حد ہے۔ اشرف رفیع صاحبہ نظم ''اَن حد'' میں کہتی ہیں کہ انسان چاہے لاکھ دعویٰ کرلے کہ اس نے کائنات کے اسرار ورموز کو جان لیا ہے۔ انہیں پہچان لیا ہے۔ ہر دن نئی نئی دریافت لے کر دنیا کے سامنے بھی آئے تو اس کی ایجاد پھر ایک نیا سوال پیدا کرتی ہے اور اس کے حد کو اَن حد کر دیتی ہے۔

یہ چاند، یہ ستارے / فلک، فرش، ریگزار
سہمے ہوئے سے پہاڑ
جنگل میں نرم نرم/ ہری پتیوں کی سیج
خوشبوؤں کی ڈھیر/ کانٹوں کی لن ترانیاں
ریتوں کی ریل پیل
سب کچھ بس ایک خاک کی/ مٹھی میں آ گیا
اَن حد کا شاہکار بھی / ان حد سا ہو گیا

پروفیسر اشرف رفیع گھر اور خاندان کی اہمیت کو جانتی ہیں۔ وہ انہیں آباد رکھنا چاہتی ہیں کہ گھر کا مطلب صرف چھت اور در و دیوار نہیں ہے بلکہ گھر کا مطلب آپسی محبت، خلوص اور اپنائیت ہے۔ جو فی زمانہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ کہتی ہیں آج کل بڑے بڑے شاندار مکانات ملیں گے مگر اب خوبصورت اور شاندار مکانوں کے پیچھے ایک سراب ہے۔ کہنے کو تو وہ گھر ہیں مگر ڈھونڈنے سے بھی وہاں گھر نہ ملے گا۔

سر پر چھپر / در، دیواریں سب ہونگی
اب یوں ہوگا
گھر ڈھونڈیں گے / گھر نہ ملے گا

''پنکھڑیاں گلاب کی''، ''لمس'' اور ''جادو'' پروفیسر اشرف رفیع کی رومانی نظمیں ہیں۔ تو ''خواب ہے یا عالمِ ہوش؟''، ''شیطنیت''، ''صبح تاریک'' اور ''ماتمِ عراق''، نظمیں دہشت گردی، ظلم و بربریت اور فسادات پر ہیں۔ ''کیسی میری بھول''، ''سوغاتیں''، ''سرِ سنگیت''، ''خطِ ابیض''، ''جشنِ چراغاں'' ان کی اہم نظمیں ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع نے اپنی شاعری میں انہیں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جنہیں وہ اپنے اطراف و اکناف دیکھ رہی ہیں اور انہیں محسوس کر رہی ہیں۔ اپنے ان احساسات کا اظہار انہوں نے اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں۔

''وہ کسی خیال کو بلند آہنگ لہجے میں بیان نہیں کرتیں۔ بلکہ بالواسطہ انداز میں ایما اور اشارے سے کام لیتے اپنے موضوع کو پرَت در پرَت کھولتی جاتی ہیں۔''

(مقدمہ، پھر سے جینا ہوگا، صفحہ ۱۴)

پروفیسر اشرف رفیع نے اپنے مجموعہ کلام ''پھر سے جینا ہوگا'' میں اپنے حقیقی قلبی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی غرض ہر شعبۂ ہائے حیات کو ان کی دور بیں نگاہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ معاشرے میں توازن رہے۔ اگر سماج میں توازن آ جائے تو سارے انسان خوش حال زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ محرومیاں اور مایوسیاں ان کی زندگیوں سے کوسوں دور ہو جائیں گی۔ ہمیں پروفیسر اشرف رفیع کی نظموں میں ایک متوازن اور مثبت سماج کی چاہ نظر آتی ہے۔

☆☆☆

سعدیہ مشتاق
حیدرآباد

اُردو ہے میرا نام' میں غالبؔ کی سہیلی

انسان کو بولنے کی صلاحیت کی بناء پر اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔فطرتاً انسان اجتماعی زندگی کو پسند کرتا ہے۔ برادری کی انفرادیت' بول چال کی شکل میں قوم یا ملک کی قومی زبان کہلاتی ہے۔ ہنداور پاک کے سوا تغیرات کے دور شاید ہی کسی اور نے دیکھے ہوں گے۔شہنشاہیت سے لے کر عوامی سطح تک تعلیم اور قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت کا فقدان رہا۔صرف فارسی اور علاقائی زبان کو دفتری زبان کا درجہ اصل تھا۔ برطانوی راج کے دوران فارسی کو بھی معدوم کرنے کی سعی کی گئی لیکن کیونکہ اسلامی ممالک کے علاوہ شعراء کا کلام اور علماء کی تحریریں بھی فارسی میں ہوتی تھیں تو اس تناظر میں اُردو دانشوروں کو فکر لاحق ہوگئی۔دہلی ہندوستان کی راجدھانی تھی جہاں ادب کا ڈیرہ تھا۔ ویسے پنجابی زبان کا چلن تھا۔اکثر شعراء جیسے میاں محمد بخش' سیف الملوک شاہ حسین' غلام فرید کی کافیاں' بابا فرید گنج شکر کا صوفیانہ کلام' وارث شاہ کا مجازی کلام' قصہ ہیر رانجھا' پیر سید فضل شاہ نواں کوٹی کی درویشانہ شاعری۔لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔خود بدیسی حاکموں نے دہلی سے اُردو کو بطور زبان جاری کیا۔گویا پنجاب کی کوکھ سے اُردو نے جنم لیا۔جس کی ترقی کے لئے حکمرانوں نے سرکاری سطح پر اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

اُردو کے معنی لشکر کے ہیں جس میں کئی سپاہی ہوتے ہیں۔اُردو میں بھی یہ معنوی خوبی ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے کئی الفاظ کو سمجھ لینے کی بے انتہا صلاحیت رکھتی ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے اُردو کو مزید فروغ دینے کے لئے دہلی کالج' کلکتہ فورٹ ولیم جیسے تعلیمی ادارے قائم کئے۔قلم کاروں سے علماء کی نایاب ولاثانی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کروایا۔سرکاری زبان فارسی اور عربی کا رسم الخط قرآن کے رسم الخط جیسا ہونے سے ہر خاص وعام نے قبول کیا' خصوصاً مسلمانو ں نے ۔متعصب لوگوں نے اپنی سی مذموم کوششیں شروع کردیں اور سنسکرت کے ٹھوس الفاظ ٹھونس کر دیوناگری رسم الخط میں بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ توانگریزوں کے عتاب نے مسلمانوں کو اُردو کا وارث بنادیا جنہوں نے بڑے چاؤ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالدیں۔ ادیبوں،شاعروں،قلمکاروں،علماء واساتذہ کے ساتھ ساتھ عوام نے بھی اس زبان کی بھرپور سرپرستی کی ۔انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی۔تصنیف' تالیف واشاعت کے سلسلے شروع ہوئے۔جامعہ عثمانیہ میں اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔تیزی سے ترقی کرتے ہوئے اُردو اور زبانوں کے مقابلے مسکراتی ہوئی لہرانے لگی جس کا شمار اعلیٰ زبانوں میں ہونے لگا' جو روشن مستقبل کی ضامن تھی۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں جب الگ قوم' الگ وطن کا سوال اٹھا تو قائد اعظم محمد علی جناح بڑے بیباکانہ اور آزادانہ انداز میں اُردو کو پاکستانی کی قومی وسرکاری زبان قرار دینے کا خیال ظاہر کیا اور یہ خواب 1947 میں پورا بھی ہوا۔متعصب ذہنوں نے پھر

سے اُردو ہندی کا تنازعہ کھڑا کر دیا اور اُردو کے عین عروج کے زمانے میں یہ انکشاف ہوا کہ انگریزی زبان سرکار کے ذہنوں پر اپنا سکہ جما چکی ہے۔ زبان کے ہنگامے پھر سے شروع ہو گئے۔ مغربی پاکستان میں اُردو نے اپنا وجود منوایا تو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر بنگلہ کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ مختلف قصبو ں وعلاقوں میں اپنی زبان کی دہائی دی جانے لگی لیکن قومی زبان صرف ایک ہوتی ہے جو زندہ قوموں کی شناخت ہوتی ہے' جو بولی اور سمجھی جاتی ہے' جو اکثریت کی مادری زبان ہو' جو آسانی سے سیکھی جا سکے' جو سب کے دلوں کی ترجمانی ہو' جس میں تہذیب کی 'ثقافت کی جھلک ہو۔ حضرت داغؔ نے کیا خوب کہا تھا:

اُردو ہے جس کا نام سبھی جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ہماری زبان جو دل کی زبان ہے' محبتوں کی امین ہے لیکن اردو صرف زبان ہی نہیں ایک تہذیب ہے' ثقافت ہے' مزاج ہے' شناخت ہے، ایک تحریک ہے اور ایک مخصوص انداز میں فکر کا اظہار بھی ہے۔ یہ پیدا تو شمال میں ہوئی۔ بچپن میں لشکری اور جوانی میں اردو کہلائی تو دکن چلی آئی ولی دکن کے اشعار میں ڈھلی تو دہلی پہنچی لیکن جڑیں دکن سے ہی جڑی رہیں دور آصف جاہی میں اردو کی بڑی پذیرائی اور سرپرستی ہوئی۔ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ تھا جو پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا چندہ بائی تھیں۔ داغ دہلوی' جلیل مانک پوری' امیرؔ مینائی، جوش ملیح آبادی' صدق جائسیؔ' فانی بدایونیؔ' حیرت بدایونی سب کے سب اُردو کے شیدائی تھے' جن پر وطن کی زمین تنگ ہونے لگی تو دکن کی طرف چلے آئے اور یہیں کی مٹی پائی۔ یہی نہیں سامریؔ کا جادو' میر تقی میرؔ کا نزاکت خیال مومنؔ کی کافرانہ ادائیں' مرزا غالبؔ کی ندرت زبان' شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کا بلند اقبال' رسوا کا عشق' سوداؔ کے قصیدے' ذوقؔ کا شوق مصاحبت' انیسؔ کی سوگواری نے اُردو کے دامن کو بے بہا نایاب موتیوں سے بھر دیا اور ایسی ایسی سوغاتیں دیں کہ محبان اُردو کو والا و شیدا بنا ڈالا۔ تہذیبی دور نے اردو کی کچھ ایسی تربیت کی کہ اپنے اقدار کے سارے خزانے لٹا دیئے۔ اُردو صرف مسلمانوں کی نہیں سارے ہندوؤں کی زبان ہے اور کوئی بھی زبان کسی خاص فرقے کی میراث نہیں ہوئی۔ فراق گورکھپوری' منشی پریم چند' جگن ناتھ آزاد' مالک رام' سبھّو رام ملسیانی' بالمکند عرش ملسیانی' خوشتر گرامی' کرشن چندر' گوپی چند نارنگ' رائے محبوب نارائن' راجہ محبوب کرن' مہاراج کشن پرشاد' راج بہادر گوڑ' سرینواس لاہوٹی۔ کیا یہ سب قلم کار محبان اُردو مسلمان تھے؟ جن کی بے لوث چاہتوں میں کوئی کمی نہ تھی یہ اُردو چار سو سال پرانی زبان ہے۔ عوامی زبان ہے جو عوام کی سرپرستی سے پنپتی' پھلتی' پھولتی رہی ہے لیکن۔۔۔ آج اپنے ہی وطن میں بے وطن سی ہے۔ آج اُردو زبان کراچی سے خیبر تک' ہندوستان سے راس کماری تک' خلیجی ریاستوں سے نکل کر مغربی و یوروپی ممالک میں بھی اپنی پہچان بنا چکی ہے جس کے الفاظ کی نرمی' جملوں کی چاشنی' معنی و مطلب کا حسن' بے مثال مضمون نگاری' دلوں کو قوس وقزح کے رنگوں میں رنگ دینے والی شاعری نے ادب کے نئے دبستان کھول دیئے۔ جہاں اقبالؔ کی بانگ درا' غالبؔ کا دیوان' حالیؔ کی مسدس' سرسید کی پوری کی پوری یونیورسٹی اپنی بازو وا کئے کھڑی ہے۔ یہ زبان کیسے مر سکتی ہے!!

اے اہل وطن بڑھ کے کلیجے سے لگا لو
اُردو کہیں حسرت سے کھڑی دیکھ رہی ہے

(اقبال اشہرؔ سے معذرت وشکریہ کے ساتھ)

☆☆☆

محمد انیس فاروقی
ٹولی چوکی، حیدرآباد

محنت کی روٹی

''بھائیو اور بہنو! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ اس گاوں کو جس میں، میں پیدا ہوا، یہیں پر میرا بچپن گزرا، اسی گاؤں کی پگڈنڈیوں پر ہم کبھی دوڑا کرتے تھے۔ اس گاؤں سے گذرتی ندی میں ہم تیرا کی کرتے تھے۔ اس گاؤں کی مٹی کی سوندھی خوشبو ابھی تک میری جسم کی رگوں میں رچی بسی ہے۔ یہ گاؤں جو کہ ہمارے انتخاب کے حلقے میں سب سے بڑا ہے۔ یہاں عوام بڑی تعداد میں بستے ہیں لیکن اس گاؤں کو ترقی کے اعتبار سے ہمیشہ نظرانداز کیا گیا۔ اس گاؤں میں آج بھی ہماری کئی ایکڑ زمین موجود ہے جس پر ہمارے ہی گاؤں کے کسان محنت کر کے اناج اگاتے ہیں۔ آزادی کے کئی برس بعد بھی اس گاؤں میں نہ ہی کوئی بڑا تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا اور نہ ہی کوئی ہسپتال حالانکہ یہ گاؤں شہر سے بس چند کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں جذباتی تقاریر پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی جھوٹے وعدے آپ سے کروں گا لیکن آپ کو یہ ضرور یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے منتخب کیا گیا تو اس گاؤں کی اعلی پیمانے پر ضرور ترقی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے گاؤں میں کالج قائم ہو جس میں معیاری تعلیم دی جاسکے تا کہ ہمارے گاؤں کے بچے شہر کا رخ نہ کریں۔ ایک معیاری ہسپتال بھی یہاں قائم کیا جائے گا جس میں ہر طرح کی طبی سہولت موجود ہوگی۔ ہمارے گاؤں کی سڑکیں ابھی تک کچی ہیں انہیں پکی سڑکوں میں تبدیل کیا جائے گا اور گھر گھر بجلی ہوگی اور ہر گلی میں بجلی کے کھمبے لگوائے جائیں گے۔ تو بھائیو اور بہنو! آپ اپنا قیمتی ووٹ مجھے دیں اور کامیاب بنائیں۔ آپ کا ووٹ گاؤں کی ترقی کیلئے ہوگا۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ جئے ہند''۔ دیپک نے اپنی تقریر ختم کی اور ڈائس سے نیچے اتر کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔ گاؤں کے عوام کی بھاری تعداد آج کے جلسہ میں موجود تھی اور وہ مطمئن تھا کہ آج کا جلسہ کامیاب رہا اور اس نے گاؤں کے عوام کے ذہنوں میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ جگہ ضروری بنالی ہے۔ اس کے ساتھی اور پارٹی رفقاء اس کے ساتھ تھے اور ہر ممکن مدد کرنے تیار تھے۔

دیپک کا بچپن اسی گاؤں میں گذرا تھا۔ اس کے پتا لکشمی نارائن اور ان کے پُرکھے اسی گاؤں میں پلے

بڑھے اور یہیں کی مٹی ان کا مقدر بنی تھی ۔لکشمی نارائن نے چندا یکڑ اراضی یہاں رکھ چھوڑی تھی جس پر اسی گاؤں کے کسان کھیتی کرتے تھے اور جو بھی فصل آتی ،اس کا آدھا ان کے حصے میں دے دیا کرتے ۔لکمشی نارائن کے دیہانت کے بعد دیپک کی ماں انورادھا نے شہر کا رخ کیا اور ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر یہاں منتقل ہوگئیں ۔ چونکہ دیپک اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا اور یہاں اعلی تعلیم کے مواقع تھے ۔

دیپک سے چھوٹی ایک بہن تھی شرمیلا جو ابھی ہائی اسکول کی طالب علم تھی ۔ دیپک نے جب انٹرمیڈیٹ اچھے نشانات سے کامیاب کیا تو انورادھا نے اسے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا پھر اس نے عثمانیہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی ۔ یہاں اسٹوڈنٹ یونین کے انتخابات میں اس نے حصہ لیا اور صدر یونین منتخب ہوا ۔یہیں سے اس کے خون میں سیاسی جراثیم داخل ہوئے جو وقتاً فوقتاً اسے سیاست میں داخلہ لینے کیلئے اکسایا کرتے ۔اس کے دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا جن میں چند سیاسی جماعتوں سے بھی وابستہ تھے اور اسے آنے والے 2014ء کے الیکشن میں حصہ لینے کیلئے اکسایا کرتے ۔آہستہ آہستہ وہ بھی اس رخ پر سوچنے لگا ۔

اب جبکہ ریاست آندھرا پردیش بھی تقسیم ہوکر دو ریاستوں میں بٹ رہی تھی اور بھارت کی انتیسویں 29 ریاست تلنگانہ وجود میں آرہی تھی تو دیپک کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ یار جبکہ تیرا تعلق تلنگانہ سے ہے تو کیوں نہ تو بھی اس بار الیکشن لڑکر تلنگانہ کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرے ۔ دوستوں کے مشورے پر وہ راضی تو ہوگیا لیکن الیکشن لڑنا کوئی معمولی بات تو نہ تھی اس کیلئے بے شمار دولت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے ۔صرف ٹکٹ حاصل کرنے کیلئے ہی لاکھوں خرچ کرنا ہوتا ہے ۔ بہت غور وخوص کے بعد اس نے یہ طے کرلیا کہ اس بار الیکشن ضرور لڑے گا ۔ اس کیلئے اس نے ماں سے بات کی ۔''ماں میں اور میرے دوست چاہتے ہیں کہ اس بار میں الیکشن لڑوں اور ایسے اسمبلی حلقہ سے لڑوں جس میں ہمارا گاؤں بھی شامل ہو۔اگر میں الیکشن جیت لیتا ہوں تو پھر ہمارے گاؤں کو ایک مثالی گاؤں میں بدل دوں گا''۔

دیپک کی ساری بات سن کر ماں نے کہا''لیکن بیٹا۔الیکشن لڑنا کوئی معولی بات نہیں ہے ۔اس میں روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے ۔تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری ضرورتیں کس طرح پوری ہوتی ہیں ۔ اگر تمہارے پتا جی گاؤں میں چند ایکڑ اراضی نہ رکھ چھوڑے ہوتے تو ہمارے لئے جینا بھی محال ہوتا ۔ وہی اراضی ہے جو ہمیں دو وقت کی روٹی مہیا کراتی ہے ۔ اور تمہاری اور تمہاری بہن کی تعلیمی ضرورتیں بھی پورا کرتی ہے اور پھر تم نے ابھی ابھی اپنی تعلیم مکمل کی ہے ۔ یہ سیاست ہمارے لئے نہیں ہے بیٹا! یہ کام دولت مند لوگوں کا ہے ۔ میں کہتی ہوں کہ یہ خیال تم دل سے نکال دو''۔ انورادھا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ۔''لیکن ماں ۔ ہمارے پاس دس ایکڑ زمین ہے ۔ میں

چاہتا ہوں کہ صرف دو ایکڑ زمین بیچ کر یہ الیکشن لڑوں ۔تم دیکھنا اگر میں جیت جاؤں گا تو سمجھو ہمارے بُرے دنوں کا خاتمہ ہوگیا اور اچھے دن ہمارے منتظر ہوں گے اور دولت ہمارے پیروں میں ہوگی''۔ یہ سن کر ماں نے کہا''بیٹا ہمیں اپنی محنت کی روٹی پر بھروسہ کرنا چاہئے''۔

دیپک کی ضد کے آگے ماں نے ہتھیار ڈال دیئے ۔اور دیپک دو ایکڑ زمین بیچ کر الیکشن میں حصہ لینے کی تیاری کرنے لگا۔ دوستوں کی کوششوں سے اسے تلنگانہ ہی کی ایک سیاسی جماعت کا ٹکٹ مل گیا اور وہ بھی اسی انتخابی حلقہ کا جس میں اس کا آبائی گاؤں شامل تھا۔ اور آج وہ اپنے ہی گاؤں میں الیکشن کے جلسے سے خطاب کر کے لوٹ رہا تھا۔

سارے ہندوستان میں الیکشن کی گہما گہمی تھی ۔ ساری ریاست آندھرا پردیش' تلنگانہ اور سیما آندھرا کے علاقوں میں انتخابی جلسے منعقد ہورہے تھے ۔ ہر پارٹی اپنی مخالف پارٹی پر الزامات کی بوچھار کررہی تھی ۔کوئی فرقہ پرستی کے نام پر ووٹ مانگ رہا تھا تو کوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیکولرازم کے نام پر۔ مذہبی رہنما بھی اپنی اپنی دکانیں چمکا رہے تھے اور اقلیتی ووٹ کی قیمت جتا رہے تھے ،اقلیتیں پریشان تھیں کہ آخر بھروسہ کریں تو کس پر کیونکہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں انہوں نے جس پارٹی پر بھروسہ کیا تھا اس نے انہیں سوائے دھوکے کے کچھ نہیں دیا تھا۔ ان کی معاشی پسماندگی ساٹھ سال پہلے جہاں تھی آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ پھر الیکشن کا وہ دن بھی آ گیا جس دن نیتاؤں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ پولنگ ہوئی ۔عوام نے بہت جوش وخروش کا مظاہرہ کیا اور بھاری تعداد میں اپنا حق رائے دہی کا استعمال کیا۔ جس دن نتائج کا اعلان ووٹوں کی گنتی کے بعد ہونے والا تھا۔ دیپک اپنے دوستوں کے ہمراہ گنتی کے مرکز پر پہنچ گیا۔تقریباً دن کے تین بجے گنتی ختم ہوئی اور جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو اس کا کٹر حریف اس سے تیس ہزار سے زائد ووٹوں سے جیت گیا تھا!

دیپک ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جب لوٹ رہا تھا تو راستہ میں اس کی نگاہ شاہراہ سے دور ایک نیم کے درخت پر پڑی جس کے سائے میں ایک کسان چادر بچھائے اپنے لڑکے کے ساتھ نیند کی گہری وادیوں میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی کار روک کر اس کے پاس پہنچ گیا جس کے قریب توشہ دان رکھا تھا۔اس نے اسے جگایا اور پوچھا''کاکا بہت میٹھی نیند سو رہے ہو؟ یہ سن کر کسان نے جواب دیا''ہاں بیٹا دھوپ میں کام کرنے کے بعد محنت کی دو روٹی کھانے اور ندی کا میٹھا پانی پینے کے بعد میٹھی نیند آ ہی جاتی ہے۔ یہ بات تم نہیں سمجھ سکو گے!!اور وہ سوچنے لگا''کاکا نے کتنی گہری بات ہی ہے'' پھر اسے اپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔''بیٹا! ہمیں اپنی محنت کی روٹی پر بھروسہ کرنا چاہئے''۔

☆☆☆

کچھ تو اِدھر بھی دیکھئے

اُردو شیریں زبان ہے، ہماری تہذیب ہے، اثاثہ ہے، اس زبان کے لئے ہمارے بزرگوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔اس سرمایہ کی حفاظت کیجئے۔خود بھی اُردو پڑھیے، اپنی نئی نسل کو بھی اُردو سکھایئے، پڑھایئے۔

انجینئر محمد فرقان سنبھلی
محلّہ دیپا سرائے۔ چوک۔ سنبھل
ضلع سنبھل 244302۔ یوپی

وراثت

''ارے سنتی ہو..... وہ پھر آ رہا ہے۔''

''اف ..... یہ لڑکا سمجھتا کیوں نہیں؟''

''کیا سمجھے وہ..... رقم کی ضرورت ہوگی اسے۔''

''ل ..... لیکن..... یہ مکان اس کا تو نہیں ہے۔''

''اب! ہمارا بھی تو نہیں ہے۔''

دونوں تاسف بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مرد نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''کتنی بار اس لڑکے کو سمجھایا کہ اپنے شہر میں ہی کوئی نوکری کر لے۔ مگر.....''

''کہتا تھا کیمیکل انجینئرنگ کیا ہے تو اس شہر میں کیا کروں گا۔''

''بھلا انجینئرنگ کرنے والے کیا سب ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔''

''اب کاہے کا افسوس کرتے ہو..... تم ہی تو کہتے تھے میرا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا۔''

''ہاں..... لیکن.....''

''تمھیں تو بھوت سوار تھا کہ لڑکے کو انجینئرنگ کراؤں گا تاکہ خوب پیسہ کما سکے۔''

''ہاں..... منّے کی ماں تم ٹھیک کہتی ہو..... لیکن کیا میرا ایسا سوچنا غلط تھا۔ کون باپ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد ترقی نہ کرے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بدبدایا۔

''لیکن ترقی کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر ملک سے بھاگ کھڑے ہو۔''

''وہ کہاں بھاگا بیچارہ..... تم ہی تو چاہتے تھے کہ سال دو سال عرب چلا جائے اور وہاں سے اچھی رقم کما کر لے آئے تاکہ یہاں بزنس کر سکے۔''

''ہاں سچ کہتی ہو تم..... میں بالکل چاہتا تھا..... اور تم ہی کہو بھلا اس میں غلط کیا تھا..... ہم نے جس غریبی کو جھیلا ہے تو کیا ہماری خواہش نہ ہوتی کہ بڑھاپے میں ذرا آرام کے ساتھ زندگی گزاریں۔''

''یہ تو ہے..... اب یاد کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ منّے کی تعلیم کے لیے تم نے کس قدر محنت کی ..... یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی کھانے نہیں آتے تھے اوورٹائم کرنے کے واسطے۔''

''ارے تو تم نے کیا کم دکھ اٹھائے ہیں منّے کی اماں..... تم بھی تو دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی تھیں۔''

''لو بھلا میں اکیلے کیسے کھا لیتی .....تم بھوکے پیٹ کام کرو اور میں کھا کھا کر موٹی ہوتی رہوں ..... یہ کون بات ہوئی بھلا؟''

مرد نے بے حد پیار بھری نظر سے بیوی کو دیکھا۔

''تبھی تم کتنی کمزور ہوگئی تھیں نا.....اگر صحت کا خیال رکھتی تو تمھیں ٹی بی جیسی بیماری تو نہ ہوتی۔''

''ارے مجھے کیا فرق پڑنا تھا.....میں تو گھر میں ہی رہتی ہوں .....لیکن تم دونوں کا خیال آتا ہے.....تم منے کو اچھا کھلانے کے چکر میں خود کتنے بیمار سے لگنے لگے تھے .....اور منا بھی بیچارا کہہ کہہ کر ہار جاتا تھا کہ ابّا اتنا کام نہ کرو .....آپ کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے مگر آپ بھی کہاں ماننے والے تھے ..... اب پڑے کھانستے رہتے ہو.....''

''ارے اگر میں اتنی محنت نہ کرتا تو منا انجینئر بن پاتا کیا اور یہ مکان بن پاتا کیا؟'' اس نے اپنے چھوٹے سے گھر کا معائنہ کیا۔ دو کمرے ایک ڈرائنگ روم، کشادہ کچن، باتھ روم اور ایک اسٹڈی روم .....خاص منے کے لیے .....تاکہ اسے ڈسٹربینس نہ ہو.....اور منے نے بھی تو کمال کیا .....کیمیکل انجینئرنگ کرنے تک ہر کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔

''لیکن اب وہ اس مکان کو فروخت کر ڈالے گا تو.....''

''تو.....کیا.....واقعی.....''

''ہاں .....وہ آیا تھا کسی کو دکھا بھی گیا ہے مکان۔''

''ہنہ.....اب ہمارے اختیار میں بھی تو کچھ نہیں۔''

''لیکن اسے تو سوچنا چاہیے کہ اس کی پرورش کی طرح ہم نے اس مکان کو بھی تو خون پسینہ سے بنایا ہے تو وہ اسے ایسے کیسے فروخت کر سکتا ہے خاص کر تب جب کہ ہم اس مکان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔''

''وقت کے ساتھ خیالات بھی تو بدل جاتے ہیں .....قسمت نے جب ہم پر ہی گرد ڈال دی تو بھلا وہ کیوں سوچنے لگا۔''

مرد بھی مغموم نظر آنے لگا تھا۔

''لگتا ہے وہ پھر آنے والا ہے مجھے اس کے قدموں کی آہٹ دور سے آتی محسوس ہو رہی ہے۔''

''تم اتنا کیوں سوچتی ہو.....مٹی ڈالو اس قصے پر .....چلو چائے بنا کر لاؤ.....آج آخری بار اپنے مکان میں چائے پیتے ہیں مل کر۔''

''آخری بار کیوں بھلا''۔ مرد نے خالی نظروں سے بیوی کو دیکھا تو جیسے وہ بات سمجھ گئی ہو۔

''آپ کیوں اداس ہوتے ہیں .....آنے دو آج اسے .....میں اسے صاف منع کر دوں گی ..... جب تک ہم اس گھر میں ہیں اسے وہ نہ بیچے۔''

''ارے نہیں ..... مجھے لگتا ہے اب ہمیں ہی نیا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔''

''ہم کیوں نیا.....کھو.....کھو.....کھو۔''

''کیا ہوا.....لگتا ہے تمھاری کھانسی پھر بڑھ گئی ہے.....اچھا یہ بریڈ مکھن لو اور ذرا کافی کی چسکی لو.....شاید تمھیں کچھ آرام ملے۔''

''ہم کتنے خوش تھے جب ..... جب سب مل کر اسی ٹیبل پر

بیٹھ کر ناشتہ کرتے تھے .....سب ایک دوسرے کو کھلانے کی فکر کرتے تھے .....مگر اب نہ تم کچھ کھاتے ہو .....اور .....اور وہ تو .....''عورت سسکنے لگی تو مرد نے پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اب تم زیادہ مت سوچو۔''

''کیسے نہ سوچوں .....میں سچ کہتی ہوں .....میرے بغیر تم بھی اکیلے ہوجاؤ گے .....تب تم کیا کرو گے .....سوچتی ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔''

''ارے تو تم کہاں جارہی ہو..... پریشان نہ ہو ٹھیک ہوجاؤ گی .....''مرد نے اپنے سینے کو ذرا دباتے ہوئے کہا اور ماتھے پر چھلک آئے پسینے کو نیپکن سے صاف کرنے کی کوشش کی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔وہ عورت کے پاس کھسک آیا۔

''لگتا ہے میری طبیعت آج زیادہ خراب ہے۔''

''میں منّے کو فون کرتی ہوں وہ ڈاکٹر کو لیتا آئے گا۔''

''ارے اب منا ہماری باتیں کہاں سن پاتا ہے..... پتہ نہیں ہماری آواز اسے سنائی نہیں دیتی یا پھر وہ سن کر بھی .....''

''میں پھر کہتی ہوں کہ اسے تم نے زیادہ چھوٹ نہ دی ہوتی تو آج وہ ایسا نہیں ہوتا۔''

''اتنی بدگمانی ٹھیک نہیں بھئی .....اس کی خطا نہیں ہے جب قسمت نے ہمیں وقت نہیں دیا''

''وہ تو بیچارا سال دو سال میں چکر لگا ہی لیتا ہے۔پھر فون بھی تو کرتا رہتا ہے۔''

''لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ؟''

''سچ کہتی ہو لیکن اس سے .....اس کی کوتاہی تو ثابت نہیں ہوتی نا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں .....وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے.....ہم جو سوچتے ہیں وہ غلط ہے .....اس کو ہمارے رہنے کا ٹھکانہ بیچنے کا فیصلہ ٹھیک ہے۔''

''تم ناراض مت ہونا..... مجھے بھی لگتا ہے کہ وہ حق بجانب ہے اس لیے ہمیں بھی اس کی راہ میں روڑے نہیں اٹکانے چاہیئں۔''

''اب آپ پھر وہی باپ بننے کی کوشش کررہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا بیٹا ہم سے دور ہوگیا۔''

''وہ دور نہیں ہے.....دیکھو وہ آرہا ہے .....وہ ہمارے قریب ہی تو ہے۔''

''آنے دو میں اسے بھی گھر سے نکال دوں گی .....کھو.....کھو.....کھو۔''

دروازہ کے چرمرا کر کھلنے کی آواز سے روشن دان میں بیٹھے پرندے اُڑ گئے۔دو قدموں نے دروازے کو عبور کر کے مکان کے اندر قدم رکھے۔اس کے پیچھے ایک شاندار جوتے اندر آئے۔اندر داخل ہونے والے دونوں شخص مکان کا معائنہ کرنے لگے۔

''دیکھا وہ پھر آ گیا اب کی تو کوئی موٹی آسامی لگتی ہے۔ کیسی شاندار پرسنلٹی ہے۔''

''تم اس کو منع کیوں نہیں کرتے کہ ہم یہاں ہیں تو یہ مکان نہ بیچے۔''عورت نے بڑے نارمل لہجے میں کہا۔

''اب کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' مرد کا چہرہ بجھا بجھا معلوم ہوتا تھا۔

''سنو تو وصیح آخر یہ لوگ کیا بات کرتے ہیں.....'' مرد چائے کا کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسٹر خان..... یہ مکان آپ کا ہی ہے۔''

''جی جناب.....میرے والدین نے بڑی محبت اور محنت سے اسے تعمیر کرایا تھا۔''

''تو تم اسے کیوں فروخت کر رہے ہو۔''

''دراصل میں گلف میں بزنس کرتا ہوں اور انڈیا آنا جانا نہیں ہو پاتا۔ اب بھی چند روز کی مہلت ملنے پر آیا ہوں اور اسے فروخت کر کے واپس چلا جاؤں گا۔''

''مسٹر خان.....مکان ہمیں پسند ہے۔''

''جی .....تو میں سودا پکا سمجھوں۔'' خان صاحب خوش ہو گئے۔

''بالکل.....لیکن یہ بتائیے کہ یہاں کوئی اب بھی رہتا ہے کیا۔''

''نہیں بالکل نہیں۔''

''لیکن یہ کپ ٹیبل پر رکھے ہیں اور ان میں بالکل تازہ سی چائے رکھی ہے اور جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں سے ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔''

''کیا بات کرتے ہیں جناب ..... یہاں کوئی نہیں رہتا .....میرے والدین اسی مکان میں رہتے تھے لیکن چھ سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ تب سے یہ مکان بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔''

آنے والا شخص کبھی مسٹر خان کو دیکھتا اور کبھی مکان کی حالت کو اور کبھی میز پر رکھے چائے کے کپوں کو ..... یقیناً وہ مسٹر خان کی معلومات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

رشوت کیسے ختم ہوگی؟

اسکول میں داخلے کے لئے ہیڈ ماسٹر نے فوٹو گرافر کو بلایا اور طلباء کی فوٹو کے لئے فی کس 10 روپے بات پکی کی۔ ہیڈ ماسٹر نے ٹیچر کو بلا کر کہا کہ ہر بچے سے 30 روپے جمع کرو۔ ٹیچر نے کلاس میں اعلان کیا کہ کل صبح ہر بچہ فوٹو کے لئے 50 روپے لے کر آئے۔ ایک بچے نے گھر جا کر ماں سے کہا کہ اسکول والے فوٹو کے لئے 100 روپے مانگ رہے ہیں۔ شام کو بچے کی ماں نے باپ کو بتایا کہ منے کے اسکول والے فوٹو کے لئے 200 روپے مانگ رہے ہیں۔ دیکھ لیا آپ نے! یہ تو ایک لطیفہ ہے' مزاح ہے' اگر حقیقت میں ایسا ہوا تو پھر ہمارے ملک سے رشوت (کرپشن) کیسے ختم ہوگی؟؟؟

کولہو کا بیل اور فلسفی

☆ چند فلسفی چلے جا رہے تھے' چلتے چلتے وہ ایک کولہو کے پاس پہنچے' رُکے اور تیلی سے پوچھنے لگے' میاں یہ تم نے بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی ہوئی ہے۔ تیلی بولا' وہ اس لئے کہ میں اگر کہیں کام کاج میں مصروف ہو جاؤں تو مجھے گھنٹی کی آواز آتی رہے اور علم ہو جائے کہ بیل رُکا نہیں اور کولہو چل رہا ہے۔ فلسفی کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے ''میاں! بات تو تمہاری منطقی ہے لیکن اگر بیل رُک جائے اور فقط اپنا سر ہلاتے رہے تو پھر کیا کرو گے؟ تیلی نے اپنا کام چھوڑا اور نظریں اُٹھائیں' غور سے اُن کو دیکھا اور کہا جناب یہ بیل ہے کوئی فلسفی نہیں۔

رشدہ شاہین
ریسرچ اسکالر
روم نمبر 101 ساؤتھ کیمپس
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد

میرا قصور کیا تھا؟

گڑیا آج پھر ایک نئے جوڑی کپڑے کی ضد لے کر بیٹھی تھی۔۔۔

''اماں مجھے ایک نیا فراک وہ بھی پھولوں والا بنوا دو نا۔۔۔'' اس نے اپنی ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولا۔

''میں بہت دن سے کہہ رہی ہوں لیکن آپ ہر بار مجھے ٹال جاتی ہیں۔اب میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔ مجھے ایک نئی ڈریس چاہیے۔میری سہیلیوں کے پاس بڑے خوبصورت پھول والی فراک ہیں مجھے بھی دلوا دو ۔میں کچھ نہیں جانتی اب مجھے نئی فراک پہننا ہے۔۔۔'' گڑیا نے بڑی عاجزی اور ضدی لہجے میں اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

سائرہ اپنی معصوم بیٹی کی اس خواہش پر مسکرا دی اور اس کو بغور دیکھنے لگی،اور دل ہی دل میں دعائیں بھی دے ڈالی''کتنی معصوم اور بھولی ہے میری بچی۔۔۔اللہ اس کو ہمیشہ بُری نظر سے بچا کر خوش اور آباد رکھے۔''

''ارے میری پیاری گڑیا! میں تم کو نیا ڈریس بنوا دوں گی وہ بھی خوبصورت پھولوں والی۔۔۔ابھی رشتے میں شادی پڑنے والی ہے نا بس اس موقعے پر تم نیا فراک پہن لینا۔۔۔اب خوش۔۔۔چلو اب جلدی سے رونا بند کر کے مسکرا دو۔۔۔سائرہ نے اپنی بیٹی کو دلاسہ دیتے ہوئے وعدہ کرلیا۔پھر اس کو مسکراتا دیکھ کر وہ بھی خوش ہوگئیں۔

اپنی خواہش کو پورا ہوتا دیکھ گڑیا کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔وہ خوشی خوشی اپنے میمنوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔

دس سال کی گڑیا ایک غریب مسلم اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔اس کے والد جنگلوں اور پہاڑوں پر جا کر بکریاں چراتے تھے اور ماں گھریلو کام کاج کر کے گھر کا گزر بسر کرلیتی تھیں۔گڑیا کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے وہ گھر میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔جب اس کے بھائی اسکول جاتے اور والد بکریاں لے کر پہاڑوں پر چلے جاتے تو وہ ماں کے ساتھ مل کر گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

گاؤں کی خوبصورت وادیوں میں اس کی پرورش ہوئی۔پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان اس کا بچپن گزر رہا تھا۔وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھی۔گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنے پالتو کتے اور میمنوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔جب بارڈر پر گولیوں کے چلنے کی آوازیں سنتی تو دہل جاتی اور اپنی ماں سے جا کر لپٹ جاتی۔معصوم

اتنی تھی کہ جب محلے یا پاس کے گاؤں میں کسی بات پہ کوئی جھڑپ ہوتی تو وہ اتنی ڈر جاتی کہ کھانا پینا چھوڑ دیتی۔

ایک دن گڑیا کے والد گھبرائے ہوئے باہر سے آئے۔اپنے بچوں کو گھر پہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بیوی سے بولے''کھڑکیوں کے پردے گرادو۔۔۔بچوں کو لے کر اندر جاؤ اور ہاں کوئی بھی آئے تو دروازہ مت کھولنا۔''ان کو اس طرح پریشان دیکھ کر سائرہ سے رہا نہ گیا اور اس نے ان سے پوچھ لیا''کیا ہوا جی !آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے اور اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہیں سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔

انہوں نے پانی پینے کے بعد اپنی سانسوں کو بحال کرتے ہوئے بولے''اللہ کرے سب ٹھیک ہی ہو۔۔۔پھر ذرا ٹھہر کر بیوی سے مخاطب ہوئے''دراصل ہم مسلمان ہیں وہی سب سے بڑا ڈر ہے ہمارے لیے۔۔۔کچھ لوگوں کی وجہ سے تمام مسلم قوم کو جھیلنا پڑتا ہے۔کیا کریں؟بس اللہ ہی مالک ہے اور وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔تم تو جانتی ہو یہاں کے حالات آئے دن خراب ہوتے رہتے ہیں۔آئے دن کوئی نہ کوئی دہشت گرد پکڑا جاتا ہے۔یوں سمجھو کہ ہر جرم کے پیچھے کسی مسلم دہشت گرد کا ہی نام سامنے آتا ہے۔اب چاہے وہ اس جرم میں شامل ہو یا نہ ہو۔اس لیے سارے مسلمانوں کو دوسرے مذہب کے لوگ اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔۔۔

''میں پہاڑی پر بکریاں چرا رہا تھا اچانک مجھے دور سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا اور پھر ایک شور سنائی دیا۔اس کے ساتھ ہی سارے چرواہے بھاگتے ہوئے نظر آئے تو میں بھی بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟آج کل دنگے فساد بھی تو بہت ہو رہے ہیں نا۔۔۔اور تم تو جانتی ہی ہو کہ مذہب کے نام پر سیاست بھی خوب ہو رہی ہے۔بس اب اوپر والا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔۔۔اتنا کہتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ان کی آنکھوں سے ڈر صاف جھلک رہا تھا۔پورا دن ڈر اور خوف میں بیتا۔

دوسرے دن گڑیا کھیل کر گھر واپس آئی تو بہت اداس تھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت روئی ہو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ماں نے جب پوچھا تو وہ لپٹ کر رونے لگی۔ان کے اصرار کرنے پر روتے ہوئے بولی''امی!ہم کون ہیں؟؟ ہم اپنے وطن سے پیار نہیں کرتے؟؟؟

سائرہ نے اس کے اِس بے تُکے سوال پر حیران ہوتے ہوئے پوچھا'' کیا ہوا بیٹا؟؟؟تم یہ کیا بول رہی ہو؟؟؟

گڑیا نے سسکیوں کے بیچ جواب دیا''جب ہم سب باہر کھیلتے ہیں تو میری کچھ سہیلیاں کہتی ہیں کہ ہم مسلمان اپنے وطن سے پیار نہیں کرتے۔۔۔ہم دہشت گرد ہوتے ہیں۔۔۔بم دھماکے جو ہوتے ہیں وہ مسلم لوگ ہی کرواتے ہیں۔۔۔امی!وہ لوگ مجھے بہت پریشان کرتی ہیں۔''

ماں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے سمجھایا''نہیں بیٹے۔۔۔ان کو جا کر بولنا کہ ہم اپنے وطن کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔۔۔ہمیں اپنے وطن سے بہت پیار ہے۔۔۔جو لوگ انسانوں کو مارتے ہیں ان کا کوئی مذہب

نہیں ہوتا ہے۔۔۔'' یہ سن کر گڑیا کا رونا کچھ کم ہوا۔ وہ ابھی بھی اداس تھی اس کو لگ رہا تھا کہ اس کی امی کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ سائرہ بھی اس کو کیا جواب دیتی کہ یہ سب غلط ہے اور اس میں کچھ لوگ اپنے مفاد کے لیے سیاسی چال بھی چلتے ہیں۔ خیر وہ ان باتوں کو جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہوگئیں اور گڑیا بھی سب بھول کر کھیلنے لگی۔

پورے ملک میں آئے دن مذہب کے نام پر چھوٹے موٹے فساد ہوتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی یہی بہت بڑے پیمانے پر ہو جاتے ہیں جس میں جان و مال کا اچھا خاصہ نقصان ہو جاتا ہے۔ اس نفرت کو ہوا دینے میں سب سے بڑا ہاتھ میڈیا اور سیاستدانوں کا ہوتا ہے۔ ورنہ عوام تو امن وسکون کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ وہ کیوں کر اپنا کچھ نقصان کرنا چاہے گی۔ لیکن کچھ لوگ مذہب کے نام پر اپنی سیاسی روٹیاں سیکتے ہیں۔ اس کا اثر شہروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی ہوا۔ جہاں سادہ مزاج لوگ مل جل کر رہتے تھے کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا لیکن آج مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔

ایک دن حسب معمول گڑیا کے والد گھر سے باہر گئے تو اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے چلی گئی۔ دوپہر ہوگئی لیکن وہ نہیں لوٹی۔ ماں کو لگا کہ کھیلتے کھیلتے پہاڑی پر اپنے ابّا کے پاس چلی گئی ہوگی یہ خیال آتے ہی وہ پُرسکون ہوگئیں۔ لیکن جب شام کو گڑیا کے والد گھر اکیلے پہنچے تب سائرہ کو فکر ہوئی وہ اپنے شوہر سے بولی ''سنئے جی! گڑیا صبح کھیلنے گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔ مجھے لگا کہ وہ آپ کے ساتھ ہوگی۔ آپ نے کہیں اس کو دیکھا کیا؟؟؟

''ارے تم پریشان مت ہو اپنی کسی سہیلی کے یہاں ہوگی، آجائے گی۔'' لیکن ماں کو ایک عجیب سا خوف اندر سے مارے جا رہا تھا۔ گڑیا کا پتہ کرنے کے لیے اپنے بیٹوں کو بھیجا۔

بھائیوں نے اس کے کھیلنے کی جگہ، اس کی سہیلیوں کے گھر پتہ کیا پر وہ کہیں نہیں تھی۔ تب وہ بھاگتے ہوئے گھر پہنچے اور پریشان ہوتے ہوئے بولے ''اماں گڑیا کہیں نہیں ہے۔'' اب والدین بہت پریشان ہوئے۔ ان کی بیٹی اچانک ایسے بغیر بتائے کہاں چلی گئی۔

رات ہو گئی تھی پہاڑیوں اور جنگلوں سے بھیڑیوں کی آوازیں آنے لگی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ گلی کوچوں میں سناٹا پسرا تھا۔ گڑیا کے ماں باپ اور بھائی گلیوں اور میدانوں میں اس کو تلاش کرتے ہوئے پکار رہے تھے۔ سنسان میدانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ گڑیا۔۔۔ گڑیا۔۔۔ میری بچی کہاں ہو۔ لیکن کوئی جواب نہ پاکر وہ سب بہت مایوس ہوئے۔ اس کی سہیلیوں کے گھر پتہ کرنے گئے لیکن سب کا یہی کہنا تھا کہ گڑیا اور ہم سب تو دوپہر میں ہی کھیل ختم کر کے گھر چلے آئے تھے۔ اب ان کی فکر اور پریشانی دوگنا ہوگئی تھی۔

وہ پاگلوں کی طرح اپنی معصوم بچی کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ راستے میں کوئی بھی ملتا اس سے گڑیا کا پوچھتے لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آدھی رات تک پریشان

ہوکر اسے ہر جگہ تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔

ماں کا رو رو کر برا حال تھا وہ اور دونوں بیٹے تھک چکے تھے۔والد نے اپنے پریشان بیٹوں اور بیوی کو روتے ہوئے دیکھا تو ان کو تسلیا دی۔''فکر نہ کرو گڑیا مل جائے گی رب پر بھروسہ رکھو۔۔۔بیٹا تم لوگ اپنے ماں کو گھر لے جاؤ میں تمہاری بہن کو کھوجتا ہوں۔''لیکن ان کا دل بھی تڑپ رہا تھا۔ان کے جانے کے بعد زار و قطار رونا شروع کر دیا اور اللہ سے دعا گو ہوئے۔۔۔''اے میرے پروردگار میری بچی کی حفاظت کرنا۔۔۔اس معصوم پر رحم کرنا۔۔۔''اپنے آنسو صاف کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔اچانک ایک خیال سے چونک پڑے۔۔۔''ہو نہ ہو وہ میرے پاس پہاڑی پر گئی ہو اور بکریوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دور نکل گئی ہو۔۔۔''

اتنا سوچنا تھا کہ بھاگتے ہوئے پہاڑی کی طرف دوڑے اور گڑیا۔۔۔گڑیا۔۔۔پکارنے لگے لیکن ان کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس ان تک پہنچ جاتی۔انہوں نے اوپر جا کر ہر طرف دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔''کہیں ایسا نہیں نا اس کو کوئی بھیڑیا۔۔۔''یہ خیال آتے ہی انہوں نے جھرجھری لی اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر بُدبُدائے۔۔۔نہیں میرے مولا ایسا نہ کرنا۔۔۔میری بیٹی کی حفاظت کرا اور میرے حال پر رحم کر۔۔۔''

پہاڑی پر دیکھنے کے بعد نیچے آئے اور دوبارہ میدانوں اور گلیوں میں تلاش کرنے لگے۔اچانک ایک پتھر سے ٹکرا کر گر گئے اندھیرے میں ان کو کچھ دکھائی نہیں دیا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔آدھی رات بیت چکی تھی لوگ اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔اماوس کی کالی رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔کبھی کبھی جنگلوں سے شیر کی دہاڑ سے ماحول اور ڈراؤنا اور خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

گڑیا کے والد بھی تھک کر چور ہو گئے تھے۔گرنے کی وجہ سے ان کے سر میں ہلکی چوٹ بھی آ گئی تھی۔سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔وہیں تھوڑی دور پر روشنی دکھائی دی قریب جا کر دیکھا تو ایک مندر تھا۔اس کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئے تبھی مندر کا پجاری باہر آیا۔اس سے بھی گڑیا کا پوچھا لیکن اس نے بھی انکار کیا۔نہ جانے کس گھڑی ان کی آنکھ لگ گئی۔دور مسجد سے اذان کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے کچھ دیر کے لیے ان کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہیں۔

بیٹی کے کھونے کا غم ایک ماں باپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔''صبح ہوتے ہی تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کراؤں گا''یہ سوچتے ہوئے مسجد کی جانب بڑھ گئے۔نماز کے بعد خطبے میں امام صاحب نے نصیحت کی اور نمازیوں سے مخاطب ہوئے''آج حالات بہت خراب ہو رہے ہیں مذہب کے نام پر سیاسی پروپیگنڈوں میں پھنسنے کے بجائے بھائی چارگی کا ثبوت دیں۔امن و سکون کا ماحول بنائیں اور نماز و روزے کی پابندی کر اللہ سے مدد مانگیں۔قرآن میں بھی آپس میں مل جل کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔اس لیے ہر مذہب کی عزت

کریں اور آپس میں مل جل کر ہنسی خوشی زندگی بسر کریں۔'' خطبہ ختم ہونے کے بعد سب اپنے گھروں کو چلے گئے۔گڑیا کے والد کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے پھر بوجھل قدموں سے گھر کی راہ لی۔ بیوی شوہر کو آتا دیکھ دوڑ پڑی اور روتے ہوئے پوچھا'' کچھ پتہ چلا؟۔کہاں ہے میری بچی؟ لیکن ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔صرف نہیں میں سر ہلا کر اندر چلے گئے۔اجالا ہوتے ہی گڑیا کے گُم ہونے کی خبر جنگل کے آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ان کے گھر لوگوں کا تانتہ لگ گیا ہر کوئی ان کو دلاسہ دے رہا تھا۔سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی'' اتنی چھوٹی اور معصوم بچی کہاں ہوگی۔۔۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔۔۔کون اس کو اُٹھا لے گیا۔۔۔کیا دشمنی اس ننھی سی جان سے تھی۔۔۔یہ لوگ تو بہت سیدھے سادے لوگ ہیں بھلا ان کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے جو اس طرح بدلا لیا جا رہا۔بہر حال جتنی منھ اتنی باتیں تھیں۔ ہر طرف اسی موضوع پر ہی گفتگو ہو رہی تھی۔

گڑیا کے والد اس کی ایک فوٹو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچے اور گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی۔انسپکٹر نے دلاسہ دیتے ہوئے ان کو گھر واپس بھیجا۔لوٹتے ہوئے وہ پھر اسی مندر پر جا کر بیٹھ گئے جہاں رات گزاری تھی اور ہر آنے جانے والے سے پوچھتے تھے لیکن سب انکار کرتے۔ پھر وہی پجاری اور اس کے ساتھ ایک دو لوگ مندر سے باہر آئے۔ان کو وہاں بیٹھا دیکھ سب کے سب تھوڑا حیران ہوئے پھر بولے'' کیا ہوا چاچا۔۔۔آپ کی بیٹی ملی۔۔۔؟'' اتنا سننا تھا وہ رونے لگے بولے نہیں۔۔۔ مجھے کہیں نہیں ملی ہر جگہ اس کو ڈھونڈا لیکن کہیں نہیں ہے۔۔۔ابھی پولس میں رپورٹ درج کروا کے آ رہا ہوں۔۔۔تم لوگوں کو کچھ پتہ چلے تو مجھے ضرور بتاؤ۔۔۔مہربانی ہوگی۔۔'' اچھا چاچا ہم چلتے ہیں کچھ معلوم ہوا تو بتا دیں گے۔''

آخر تھک ہار کر وہ بھی گھر پہنچے اور جاتے ہی لیٹ گئے۔بیٹی کو کھو کر وہ ایک دم نڈھال ہو گئے تھے۔ایسا لگ رہا تھا مانو وہ کتنے دن سے بیمار ہیں۔وہی حال گڑیا کی ماں اور بھائیوں کا بھی تھا۔شام ہوتے ہی ان کے کچھ رشتہ دار بھی آ گئے سب اس کی کھوج میں لگ گئے لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔دوسرے دن پھر پولیس اسٹیشن جا پہنچے اور روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولے۔۔۔'' صاحب! میری بیٹی بہت چھوٹی ہے اس کو یہاں کے راستے بھی ٹھیک سے نہیں معلوم ہیں۔نہ جانے وہ کہاں بھٹک رہی ہوگی۔۔۔؟ میری بیٹی کو کھوج کر ہماری مدد کیجیے۔۔۔ہم آپ کے احسان مند رہیں گے۔۔۔ان کے دلاسے کے بعد وہ گھر آئے اور بیوی سے بولے'' انہوں نے کہا ہے کہ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کی بیٹی مل جائے ہماری ٹیم اس کو ڈھونڈھ رہی ہے آپ فکر نہ کریں۔۔۔''

کیسے فکر نہ کریں ۔۔۔ہماری بیٹی کل سے غائب ہے۔۔۔پتہ نہیں اس نے کھانا کھایا بھی ہے کہ نہیں آپ تو جانتے ہیں کہ اس کو بھوک برداشت نہیں ہے۔۔۔ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔۔۔اور آپ کہتے ہیں کہ صبر کریں۔۔۔کہاں سے صبر کریں اور کیسے کریں۔۔۔'' سائرہ جھلاتے ہوئے بولی۔اس کا جواب شوہر کے پاس بھی نہیں تھا

۔''میں پھراس کا پتہ کرنے جارہاہوں۔۔۔رب سے مایوس مت ہووہ بہت کارساز ہے۔۔۔''

شام میں دروازے پر دستک ہوئی ۔سائرہ دوڑتے ہوئے دروازے پر گئی اس امید کے ساتھ شاید پولیس والے ان کی بیٹی کو لے کر آئے ہیں۔لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ چونک گئی یہ وہی درزی تھا جس کو سائرہ نے گڑیا کا فراک سلنے کے لیے دیا تھا۔آج وہی سِل کر لے آیا تھا۔فراک لے کر وہ اندر آتے ہی اس کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔''کہاں ہو بیٹی۔۔۔؟میری گڑیا!۔۔۔آجاؤ جلدی سے واپس۔۔۔دیکھوتمہارا فراک آ گیا ہے۔۔۔تم ضد کرتی تھی نا۔۔۔دیکھو۔وہ پاگلوں کی طرح درودیوار کو وہ فراک دکھا رہی تھی۔غم کے مارے اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔

آج دوسری رات گڑیا کے گھر والوں کے لیے بڑی بھاری پڑ رہی تھی۔اس کے جانے کے بعد ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں کوئی ہے ہی نہیں سب کو چپ سی لگ گئی تھی۔اس کے میمنے اور کتے بھی خاموش تھے وہ بھی مانو اسے ہی ڈھونڈھ رہے تھے۔ایک وحشت اور ڈر نے گھر والوں کی نیندوں کو اُڑا رکھا تھا۔اب تو محلے والوں کو بھی فکر ہو گئی تھی۔سب اس کے ملنے کی دعائیں کر رہے تھے۔اپنے علاقے کے کونے کونے میں، ہر گلی کوچے ،میدانوں اور گھروں میں پتہ کیا پر وہ کہیں نہیں تھی۔وہ وہاں ہوتی تب نا اس کا کچھ پتہ چلتا۔اسی کشمکش اور پریشانی کے عالم میں یہ رات بھی گزر گئی۔اجالا ہوتے ہی لوگ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔اس کے غائب ہونے کے بعد اس کے والد بکریوں کو چرانے نہیں گئے تھے۔وہ بیٹی کے غم میں ٹوٹ چکے تھے۔ہر وقت اس کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا اور پھر ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی۔

اگلے دن کچھ چرواہے اپنی بکریوں کو لے کر جنگلوں سے ہوتے ہوئے جارہے تھے۔کچھ دوری پر ان کو کوئی بچہ اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا۔اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی۔کچھ لوگوں نے جا کر گڑیا کے والد کو بھی خبر کی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ایک انجانے ڈر اور خدشے کے ساتھ کانپتے ہوئے آگے بڑھے۔قریب جا کر دیکھا تو بچے کا کپڑا کچھ جانا پہچانا لگا اور قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک چھوٹی بچی کی لاش پڑی تھی۔اس کے کپڑے تِتّر بِتّر تھے۔آس پاس خون کی کچھ بوندیں پڑی ہوئی تھیں۔ہاتھ پاؤں میں گہرے زخم صاف دکھائی دے رہے تھے۔تب تک پولیس بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔جب انہوں نے لاش کو پلٹا تو وہ معصوم گڑیا تھی۔اس کو دیکھتے ہی اس کے والد کی ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔گڑیا کی حالت اور اس کے پھٹے کپڑے اس پر ہوئے ظلم کی پوری داستان بیان کر رہے تھے۔اس کے جسم کے سارے زخم اس پر بیتی ایک ایک کہانی کو چیخ چیخ کر پیش کر رہے تھے۔اس کے ادھ کھلے ہونٹ اور آنکھیں وہاں کھڑے لوگوں سے سوال کر رہی تھیں کہ''میرا قصور کیا تھا۔۔۔؟؟؟مجھے ایسا دردناک عذاب کس قصور میں دیا گیا۔''

☆☆☆

رحمٰن جامؔی
حیدرآباد

غزلیں

ہر بار اُسے سن کر میں ہوگیا گُم سُم سا
آواز میں جادو تھا لہجہ تھا ترنم سا
آنکھوں میں شرارت تھی ہونٹوں پہ تبسم سا
ہے اُس کی اداؤں سے اس دل میں تصادم سا
آنکھوں کا جب آنکھوں سے ہوتا ہے تصادم سا
سنّاٹا بھی خود جیسے لگتا ہے تکلّم سا
جب کیفیتِ دل کے اظہار کا وقت آیا
محسوس ہوا اُس کی آنکھوں میں تبسّم سا
اک ہم بھی جیالے ہیں دنیا سے نرالے ہیں
اک یہ بھی حقیقت ہے کوئی بھی نہیں تم سا
جب آنکھ ملی تم سے جذبات میں ہلچل تھی
اُس دل کے سمندر میں برپا تھا تلاطم سا
اُس شوخ کی آنکھوں کی جب میں نے زباں سمجھی
محسوس ہوا جامؔی ہر لفظ تکلّم سا

oOo

پتہ چلتا کہ اکثر سوچتا رہتا ہوں میں کیا کیا
مری ہر سوچ کو اے کاش! کمپیوٹر بتا سکتا
سبھی ہنس بول کر چُپ ہورہے، میں رو پڑا تنہا
تری مُسکان کا مطلب فقط میں ہی غلط سمجھا
ترے ہمراہ اتنی دور تک آکر بچھڑنا تھا
تو بہتر تھا کہ بن جاتا میں خود ہی آشنا اپنا
بھٹک کر آگیا چوروں کی بستی میں علی بابا
مگر اس دور میں اُس پر کوئی سِم سِم نہیں کھلتا
ابھی تک ہورہا ہے دَرد کے احساس کا چرچا
جہاں مَیں اُس کو چھوڑ آیا ابھی تک ہے وہیں دنیا
نظر آیا مجھے رحمٰن جامؔی ظرف دُنیا کا
تماشا میں نے دیکھا ہے جَلا کر آشیاں اپنا

oOo

ڈاکٹر نادرؔ المسدوسی
23-2-318
مغلپورہ، حیدرآباد 002 500 (تلنگانہ)

غزلیں

شعر گوئی میں اُبھرتے رہے منظر کتنے
دل کی دیوار میں لگ جاتے ہیں نشتر کتنے

لب و رخسار پہ کہنے کی روایت ہے قدیم
کہنے والے ہیں مسائل پہ سخن ور کتنے

رہبروں میں کہاں آسان ہیں اندازہ کریں
خودغرض کتنے ہیں بے لوث ہیں رہبر کتنے

رب ہی جانے کہ حقیقت میں حقیقت کیا ہے
کتنے کمتر ہیں یہاں اور ہیں برتر کتنے

داڑھی چہرے پہ ہے اور سر پر ہے ٹوپی جس کے
اس کی پاداش میں الزام ہیں سو پر کتنے

گھر میں پیدا ہوئے مسلم کے تو مسلم ہیں ہم
ہیں جو پابندِ شریعت وہ ہیں پیکر کتنے

روز و شب ساتھ تو رہتے ہیں جو احباب کئی
دیکھنا یہ ہے کہ آتے ہیں کسوٹی پر کتنے

کیا کہوں کچھ بھی تو میں کہہ نہیں سکتا نادرؔ
تیری ہی صنف میں ہیں موجود ستمگر کتنے

oOo

روزِ محشر کا اُسے جب بھی خیال آتا ہے
نفس کے مکر کو آسانی سے ٹال جاتا ہے

جب بھی آتا ہے وہ محفل میں بحال آتا ہے
پھول اشعار کے جھولی میں سنبھال آتا ہے

رات کو چین نہیں، دن کو بھی آرام نہیں
رات دن مجھ کو تو بس اُس کا خیال آتا ہے

چاند بھی پھیکا نظر آتا ہے آگے اُس کے
جب بھی آنکھوں میں مرے اُس کا جمال آتا ہے

جب کسی قوم میں ہوتی ہے اُخوت کی کمی
تو سمجھ لیجئے پھر اُس پہ زوال آتا ہے

رہنما جانیں گے کل روزِ قیامت میں ضرور
کس طرح عہدوں پہ رہنے کا وبال آتا ہے

جب بھی بدکاریاں بڑھتی ہیں زمانے میں بہت
قہرِ قدرت سے زمانے میں اکال آتا ہے

سامنے کوئی کرے بات غلط تو نادرؔ
میں بھی انسان ہوں مجھ کو بھی جلال آتا ہے

oOo

جمیلؔ نظام آبادی

نظام آباد

غزلیں

خوشبو ہے رنگ و نور ہے نغمہ ہے زندگی
قدرت کا اک حسین سا تحفہ ہے زندگی
میں کیا بتاؤں میرے لئے کیا ہے زندگی
اللہ کے حبیب کا صدقہ ہے زندگی
یہ بھی تو سچ نہیں ہے کہ پیسہ فضول ہے
اور یہ بھی سچ نہیں ہے کہ پیسہ ہے زندگی
تم زندگی کو چاہے کوئی نام دو مگر
میرے لئے تو ایک تماشہ ہے زندگی
پستی بھی موت ہے یہاں بیچارگی بھی موت
جذبہ و جوش، عزم و ارادہ ہے زندگی
انسان اس کو خود سے جدا کرسکے بھی کیوں
انسان کے وجود کا حصہ ہے زندگی
تاریکیوں سے اس کو بچانا ہے کیونکہ یہ
سانسوں کے آنے جانے کا رستہ ہے زندگی
مرنے کے بعد کوئی بھی ملتا نہیں کبھی
ایک دوسرے سے ملنے کا ذریعہ ہے زندگی
اب کون زندگی پہ بھروسہ کرے جمیلؔ
بس آتی جاتی دھوپ کا سایہ ہے زندگی

oOo

خیال وفکر کی آوارگی نے لا چھوڑا
سخنوروں میں مجھے شاعری نے لا چھوڑا
میں سب کے بیچ میں رہ کر بھی تنہا تنہا ہوں
مجھے اس حال میں میری خودی نے لا چھوڑا
یہاں تو چاروں طرف ہی سراب لگتا ہے
یہ کس مقام پہ تشنہ لبی نے لا چھوڑا
میں زندگی تجھے اپنانا چاہتا تھا مگر
یہ تجھ سے دور مری بے بسی نے لا چھوڑا
بہت گھنا ہے یہ جنگل مرے تصور کا
مجھے یہاں مری دیوانگی نے لا چھوڑا
حضورؐ آپؐ کی چوکھٹ پہ آگیا ہوں میں
مرے نصیب کی پاکیزگی نے لا چھوڑا
فرازِ دار پہ میں آگیا ہوں ہنستے ہوئے
یہاں جمیلؔ مری سرکشی نے لا چھوڑا

oOo

فاروقؔ عارفی
حیدرآباد

غزلیں

زمانہ ساتھ ہے جب تک زمانہ ساتھ دیتا ہے
پھر اس کے بعد جانے کون کس کا ساتھ دیتا ہے
جہاں بیکار ہوجاتے ہیں سارے خون کے رشتے
وہاں اک درد کا رشتہ ہمارا ساتھ دیتا ہے
گزارا کررہے ہیں آج ہم اک ایسی دنیا میں
پرایا ساتھ دیتا ہے نہ اپنا ساتھ دیتا ہے
ہمارے دور میں اخلاق کی رسمیں نہیں باقی
جہاں پر مصلحت ہو کون حق کا ساتھ دیتا ہے
اجازت بس اسی کو ہے ہمارے ساتھ چلنے کی
جو بستی کو جلانے میں ہمارا ساتھ دیتا ہے
سزا معصوم کو ملتی ہے قاتل چھوٹ جاتا ہے
ہمارے دور میں انصاف کس کا ساتھ دیتا ہے
اندھیروں سے تو اے فاروقؔ ہم نے دشمنی کرلی
کہاں تک دیکھنا ہے اب اُجالا ساتھ دیتا ہے

oOo

فساد شہر میں اب کے نہیں شاید بچا کوئی
درو دیوار سب چپ ہیں نہیں آتی صدا کوئی
جسے دیکھا پریشاں حال دیکھا اس زمانے میں
جو بانٹے درد و غم ایسا نہ بستی میں ملا کوئی
اگر اتنا غرور حسن تم کو ہے تو یہ سن لو
کہ مل ہی جائے گا تم جیسا ہم کو دوسرا کوئی
خود اپنی رہنمائی میں کریں گے ہم سفر تنہا
ہمیں گمراہ کرنے کو نہ آئے رہنما کوئی
اک ایسے دور میں جب سانس لینا بھی خطا ٹھہرے
دعا یہ ہے کہ جینے کی نہ دے ہم کو دُعا کوئی
میں اپنی ذات کی دیوار میں محصور ہوں ایسا
نکلنے کا نہیں ہے اب یہاں سے راستا کوئی
وہاں پرواز میری فکر کی فاروقؔ پہنچی ہے
جہاں پہنچی نہیں ہے آج تک فکرِ رسا کوئی

oOo

محبوب خان اصغرؔ
11-2-192، ملے پلی حیدرآباد،
تلنگانہ۔500001

غزلیں

سومشورے دے جاتے ہو زحمت نہیں کرتے
غم بانٹ لو بے فیض نصیحت نہی کرتے
محسن نگہِ رب میں ہوا صاحبِ عزت
ظالم ہیں جو خود اپنی ہی عزت نہیں
تہذیبِ جہالت میں ہر ایک جرم ہے جائز
انہونی بھی ہوجائے تو حیرت نہیں کرتے
پھرتے ہو لٹاتے ہوئے ظلمت کو جہاں میں
اب بس بھی کرو ایسی سخاوت نہیں کرتے
ڈھاتے ہیں ستم دیش کی سنتان پہ ناداں
غدارِ وطن ہیں جو مروت نہیں کرتے
دولت ہے امانت نہیں جاگیر یہ اپنی
ذیِ عقل امانت میں خیانت نہیں کرتے
ہوں صاحبِ ایماں بھی تو مشکوک ہے ایماں
اپنوں سے اگر لوگ مروت نہیں کرتے
عرفان جنہیں حرف و ہنر کا نہیں ہوتا
الفاظ اگلتے ہیں ریاضت نہیں کرتے
تہذیب جسے کہتے ہیں سنجیدہ روش ہے
اصغرؔ جو مہذب ہیں حماقت نہیں کرتے

oOo

سحاب نور برسا بھی مگر مٹی کہاں نم ہے
وہاں کیسے چلے کشتی جہاں پانی بہت کم ہے

پلٹ آؤ نئی سمتوں کی جانب ذاکرینِ غم
ہوس کی راہ میں محرومیاں ہیں عُسرتِ غم ہے

دمِ تخلیقیت ہے استعارہ زیست کا مقتل
وقارِ فکر ہے زخمی، خدنگ اک دل میں مدغم ہے

درونِ ذات کا قیدی اگر آزاد ہوجائے
تو سوزِ حریّت ذوقِ شرارہ دُرِّ شبنم ہے

شناسائی ہے سمتوں کی نہ کوئی آنکھ بینا ہے
خرِد کی رہبری مفقود اور تقلید باہم ہے

اٹھا دی رسم اصغرؔ نے جو صدیوں پر مسلط تھی
مگر رائج، یہ شاطر مصلحت زادوں میں تاہم ہے

oOo